تعلیم و تربیت
نومبر 2013ء
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا؟
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

73واں سال ساتواں شمارہ

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

اس شمارے میں

اور بہت سے دل چسپ تراشے اور سلسلے

سرورق: یومِ پیدائش علامہ اقبالؒ

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

اکابر و اسلاف کی یاد منانا اور ان کے کارناموں کو نئی نسل سے روشناس کرانا ایک قومی فریضہ ہے۔ زندہ قومیں اپنے بزرگوں کے نام اور کام کو ہمیشہ یاد رکھتی ہیں۔ 9 نومبر شاعرِ مشرق، حکیم الامت اور مصورِ پاکستان ڈاکٹر علامہ اقبالؒ کا یومِ پیدائش ہے۔ آپ 9 نومبر 1887ء کو شہر سیالکوٹ میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے اپنی شاعری کے ذریعہ ملتِ اسلامیہ کو بیداری کا پیغام دیا۔ وہ ملی شاعر، عظیم قائد اور ملتِ اسلامیہ کے مخلص راہنما تھے۔ انھوں نے مختلف النوع طریقوں سے قوم کی خدمت اور تربیت کی اور عملی سیاست میں حصہ لیا۔ انھوں نے پاکستان کے نظریئے کو باقاعدہ طور پر پیش کیا۔ مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الہٰ آباد کا خطبۂ صدارت ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ نے دو قومی نظریئے کی روشنی میں برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک آزاد اور خود مختار مملکت کا تصور پیش کیا تھا۔ آپ مسلمانوں میں عمل، محبت اور اتحاد کا جذبہ پیدا کرنے کے خواہش مند تھے، ان کی شاعری اس خواہش کا بھرپور اظہار کرتی ہے۔

گو اقبالؒ کا پاکستان ایک ایٹمی قوت بن چکا ہے مگر اس کے باوجود اس کی بقاء، استحکام اور اس کا اقتصادی و معاشی مستقبل شدید خطرات کی زد میں ہے اور پاکستانی قوم حقیقی معنوں میں جہد للبقا میں مصروف ہے۔ حضرت علامہ اقبالؒ نے متحدہ ہندوستان سے الگ اسلامی ریاست کا جو تصور پیش کیا تھا، وہ بننے کے بعد بیگانوں کی سازشوں اور اپنوں کی بے تدبیریوں سے پچیس سال میں ناکام ہو گیا۔ بدقسمتی سے ہم دشمنوں کے ناپاک عزائم سے واقف ہونے کے باوجود انھیں ناکام بنانے کے لیے بحیثیت قوم ایسی مشترکہ تدابیر کرنے میں ناکام چلے آ رہے ہیں جو وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہیں۔ موجودہ نامساعد حالات، بیرونی سازشوں، دہشت گردی اور علاقائی منافرت پھیلانے والی قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے جس اتحاد و یک جہتی کی ضرورت ہے وہ مفقود ہے۔ حکمرانوں کو زمینی حقائق کا اعتراف کرنا چاہیے اور پاکستان میں ان قوتوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

حضرت علامہ اقبالؒ نے مغرب کی وطنیت، قومیت اور فریب کارانہ معاشرتی و سیاسی اصطلاحات کا راز فاش کیا اور دنیا کو محبت، یقین اور عمل کی تعلیم دی۔ فلسفۂ خودی کی تبلیغ کر کے مشرق کو خود شناسی اور خود اعتمادی کا سبق پڑھایا۔ بچو! آج ہم سب کو علامہ اقبالؒ کی دی ہوئی تعلیم پر عمل کر کے فلاح پانے کی ضرورت ہے۔

آپ نے اکتوبر 2013ء کے تعلیم و تربیت کو جس طرح پسند کیا اور اس کے سلسلوں کو سراہا، اس کے لیے ہم آپ کے بے حد مشکور ہیں۔ آپ کے خطوط اور آراء سے ہمیں بڑی تقویت ملتی ہے اور ہم خوب سے خوب کی تلاش میں رہتے ہیں۔

اب اس ماہ کا رسالہ پڑھیے اور اپنی آراء اور تجاویز سے آگاہ کیجیے۔ خوش رہیں، شاد رہیں اور آباد رہیں۔

فی امان اللہ! (ایڈیٹر)

چیف ایڈیٹر	ایڈیٹر، پبلشر	اسسٹنٹ ایڈیٹر	مشیر	سرکولیشن اسسٹنٹ
عبد السلام	ظہیر سلام	عابدہ اصغر	سعید لخت	محمد بشیر راہی

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ "تعلیم و تربیت" 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔
فون: 36361310-36361309 فیکس: 6278816

پرنٹر: ظہیر سلام
مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمٹیڈ، لاہور۔
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائد اعظم، لاہور۔

خط و کتابت کا پتا
ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور۔
UAN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-6278816
E-mail:tot.tarbiatfs@gmail.com
tot tarbiatfs@live com

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک)= 500 روپے۔
مشرق وسطی (ہوائی ڈاک سے)= 2000 روپے۔
ایشیا، افریقا، یورپ (ہوائی ڈاک سے)= 2000 روپے۔
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے)= 2000 روپے۔

قیمت فی پرچہ: 25 روپے

حمد باری تعالیٰ

یہاں بھی تو وہاں بھی تو زمیں تیری فلک تیرا
کہیں ہم نے پتا پایا نہ ہرگز آج تک تیرا

صفات و ذات میں یکتا ہے تو اے قادرِ مطلق
نہ کوئی تیرا ثانی ہے نہ کوئی مشترک تیرا

کسی کو کیا خبر کیوں خیر و شر پیدا کیا تو نے
کہ جو کچھ ہے خدائی میں وہ ہے لاریب و شک تیرا

تیرے فیضِ کرم سے نار و نور آپس میں یک دل ہیں
ثنا گر یک زباں ہر ایک ہے جن و ملک تیرا

فلک: آسمان
ثانی: ہم پلہ
یکتا: اکیلا
قادرِ مطلق: پوری پوری قدرت رکھنے والا، اللہ تعالیٰ
لاریب: بے رشک
نار: آگ

نعت رسولِ مقبولؐ

وہ شمع اُجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اک روز چمکنے والی تھی کل دنیا کے درباروں میں

گر ارض و سما کی محفل میں لولاک لما کا شور نہ ہو
یہ رنگ نہ ہو گلزاروں میں یہ نور نہ ہو سیاروں میں

جو فلسفیوں سے کھل نہ سکا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہوا
وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دُکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں

ارض و سما: زمین و آسمان
گلزاروں: باغوں
نکتہ ور: باریک بات جاننے والا
عاقل: عقل مند
لولاک لما خلقت الافلاک: یعنی اگر رسولؐ کی ذات نہ ہوتی تو میں (اللہ) آسمانوں (کائنات) کو پیدا نہ کرتا۔

پیارے بچو!

بہت سے لوگ اپنے آپ کو دوسروں سے اعلیٰ و برتر سمجھتے ہیں۔ اسی برتری اور بڑائی کی وجہ سے وہ دوسروں سے گھلتے ملتے نہیں، سیدھے منہ بات نہیں کرتے کہ یہ مجھ سے کم تر ہے، بھلا میں اس کو کیوں منہ لگاؤں۔ ہر کسی نے اپنے لیے برتری اور بڑائی کا ایک معیار بنایا ہوا ہے۔ ہر ایک کی سوچ جدا جدا ہے، کوئی کیا سوچتا ہے اور کوئی کیا......؟ کوئی سوچتا ہے کہ میری تعلیم زیادہ ہے اس کی کم، اس لیے میرا رتبہ زیادہ ہے۔ کوئی سوچتا ہے کہ میرے پاس مال و دولت کی کثرت ہے اور یہ بے چارہ غریب، تو میں اس کے منہ کیوں لگوں۔ کوئی سوچتا ہے کہ میں خوب صورت ہوں یہ بدصورت، اس لیے بھلا اس کا اور میرا کیا جوڑ۔ کوئی سوچتا ہے کہ میرا رنگ صاف اور گورا ہے اور یہ میلا اور کالا کلوٹا بھلا ہمارا آپس کا کیا میل ہے۔ پس کوئی مال و دولت کی وجہ سے، کوئی اپنے رنگ و روپ کی وجہ سے اور کوئی اپنی لیاقت و ذہانت کی وجہ سے غرور اور مستی میں مبتلا ہوتا ہے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک عزت والا اور فضیلت والا کون ہے تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''بے شک اللہ کے ہاں تم میں معزز وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔'' (الحجرات: آیت13)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے جسموں کی طرف نہیں دیکھتا اور نہ تمہاری صورتوں کی طرف دیکھتا ہے بلکہ وہ تمہارے دلوں کی طرف دیکھتا ہے اور (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آخری جملہ ارشاد فرماتے ہوئے) اپنے سینہ کی طرف اشارہ فرمایا۔''

(مسلم شریف، کتاب البر والصلۃ والآداب:2564)

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قابلِ عزت وہ ہے جو پرہیزگار ہے اور جس کا عمل اخلاص سے بھرپور ہے۔ اگر آپ پرہیزگار بننا چاہیں تو نیکی کو اختیار کرنا ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنا ہوگا اور اگر آپ اخلاص حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو نیک نیتی سے کام کرنا ہوگا کہ اس سے میرا اللہ راضی ہو جائے۔ دکھلاوا اور شہرت کی تمنا اخلاص کو ختم کر ڈالتے ہیں۔

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا:

''دیکھ! تو کسی گورے اور کالے سے اچھا نہیں مگر یہ کہ تو اس سے تقویٰ میں بڑھ جائے۔'' (مسند احمد، کتاب مسند الانصار:21407)

پیارے بچو!

اگر آپ اللہ تعالیٰ کے ہاں پیارے بننا چاہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مجھے بلند درجات حاصل ہوں......تو پھر نیکی کو اختیار کیجیے، نیکی کو عام کیجیے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچیں اور کسی کو حقیر مت جانیں، سب اللہ کی مخلوق ہیں کسی کو کسی پر فضیلت حاصل نہیں، ہاں! صرف تقویٰ ہی معیارِ فضیلت ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا کہ صدقہ سے مال میں کمی نہیں آتی بلکہ اضافہ ہوتا ہے اور قصور معاف کر دینے سے آدمی نیچا نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ اس کو سربلند کر دیتا ہے اور اس کی عزت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور جو بندہ اللہ تعالیٰ کے لیے فروتنی اور خاکساری کا رویہ اختیار کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو رفعت اور بالاتری بخشے گا۔

(صحیح مسلم، معارف الحدیث)

بدگمانی کا عذاب

جدون ادیب

میں غریب والدین کا بیٹا تھا اور آج خوش حال لوگوں میں میرا شمار ہوتا ہے۔ یاسر ایک امیر باپ کا بیٹا تھا اور آج غریب آدمی کے روپ میں میرے سامنے آیا تھا۔

شاید آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ ایک روایتی اور بور کہانی ہے کہ دولت کے غرور میں دولت مند یاسر تباہ ہو گیا اور میں اپنی محنت سے دولت مند بن گیا۔ آپ کی طرح میں نے بھی ایسی لاتعداد کہانیاں پڑھی ہیں مگر یہ ان سے مختلف اور ایک غیر روایتی کہانی ہے، ایک ایسا سچا واقعہ جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا اور میرا اپنی شخصیت پر اعتماد کرچی کرچی ہو گیا۔

یاسر سے میرا پہلا تعارف جماعت ششم میں ہوا، جب میرے والد صاحب نے مجھے اپنی حیثیت سے بڑھ کر ایک مہنگے مگر بہت اچھے اور معیاری اسکول میں داخل کروایا۔ فطری طور پر میری شخصیت دبی ہوئی تھی اور میں روشنیوں، کاروں اور دولت کی ریل پیل میں مزید دب کر رہ گیا تھا، تاہم یہ یاسر ہی تھا جس نے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور مجھے احساسِ کمتری سے باہر نکال دیا۔

ہماری دوستی میٹرک تک برقرار رہی اور یاسر نے یہ دوستی بڑی شان اور بے نیازی سے نبھائی۔

یاسر کے سینے میں ایک ہمدرد اور حساس دل دھڑکتا تھا۔ وہ نیکی کرنے اور دوسروں کی مدد کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ مجھ پر تو خاص عنایتیں کرتا۔ اسے گھر کے کھانے پسند تھے۔ میری امی مجھے ایک پراٹھے پر تھوڑا سا سالن یا انڈہ رکھ کر دیتی تھیں۔ یاسر بڑی بے تکلفی سے میرا لنچ ہڑپ کر جاتا اور مجھے کینٹین میں لے جا کر وہ چیزیں کھلاتا، جن کے لیے میں ترستا تھا۔ وہ میری امی کے ہاتھ کے ذائقے کا دیوانہ تھا۔ وہ اسکول کے باہر بھی میرا دوست تھا۔ وہ اپنی کار میں مجھے گھمانے کے لیے لے جاتا، قیمتی کتابیں اور مفید کھلونے تحفے میں دیتا اور اپنے محل جیسے گھر میں لے جا کر بھی میری خاطر مدارات کرتا۔ ایک بار وہ میرے گھر آیا تو کھانا کھا کر اٹھا اور میری امی کا زبردستی بیٹا بن گیا اور یوں اکثر فرمائشیں کر کے کھانے پکوانے لگا۔ گھر کا کھانا اس کی کمزوری تھا اور امی کو بھی اس کی خواہش پوری کرنا اچھا لگتا تھا، البتہ میرے

والد اس سے میری دوستی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ دوستی ہمیشہ ہم پلہ لوگوں سے کی جائے مگر اس کے باوجود ہماری دوستی قائم رہی۔ گڑیا کو اس نے اپنی بہن بنا لیا اور اس کی وہ ساری خواہشیں پوری کر دیں جو ہم نہیں کر سکتے تھے۔

میٹرک کرنے کے بعد ہمارا ساتھ چھوٹ گیا۔ وہ فائن آرٹس کی تعلیم حاصل کرنے لگا اور میں نے محنت کر کے ایم بی اے کر لیا اور ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھے عہدے پر فائز ہو گیا۔ میں نے امی ابو کو حج کرایا اور گڑیا کی شادی دھوم دھام سے کر دی۔ پھر امی نے میری شادی بھی کرا دی۔ مجھے چھوٹا سا خوب صورت گھر مل گیا، کار مل گئی۔ دو بچے ہوئے تو لگا کہ زندگی کی ساری خوشیاں میں نے پالی ہیں۔

مجھے یہ سب کچھ ایک دن میں نہیں ملا تھا۔ میں نے سخت محنت کی تھی اور اپنی تعلیم ادھوری نہیں چھوڑی تھی۔ تمام تر مشکلات کے باوجود اپنی تعلیم مکمل کی تو اس کے ثمرات سے میری معاشرتی حالت میں تبدیلی آئی تھی۔ اب آپ یوں سوچ رہے ہوں گے کہ کہانی کا بور مرحلہ آ گیا، جب میں آپ کو یاسر کے تعلیم مکمل نہ کرنے کی کہانی سنا کر اور ایک لیکچر جو تعلیم کی افادیت و اہمیت پر ہوگا، سنا کر اپنی کہانی ختم کر دوں مگر ایسا کچھ نہیں ہے۔ یاسر نے بھی ماسٹر کر لیا تھا اور یہ بات مجھے تب پتا چلی، جب یاسر مجھے 15 سال کے بعد ملا۔

یاسر مجھے سڑک پر ملا۔ وہ بہت شکستہ حلیے میں نظر آیا۔ اس کی پینٹ قدرے میلی اور شرٹ پرانی تھی اور پاؤں میں جوتوں کے بجائے چپل تھی۔ میں اپنے محسن دوست کو کیسے بھول سکتا تھا۔ میں نے کار روک کر اسے جا لیا اور جب اس نے بھی مجھے پہچان لیا تو بڑی گرمجوشی سے مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ پھر وہ کچھ جھجکتے ہوئے میری کار میں بیٹھ گیا۔

میں یاسر کی کہانی سننے کو بے تاب تھا مگر اس نے ٹھیک طرح سے اپنے بارے میں نہیں بتایا۔ بس یہ کہا کہ وہ سوتیلے بھائیوں سے جھگڑے کے بعد الگ رہ رہا ہے اور کہیں ملازمت بھی کرتا ہے۔ یاسر کی حالتِ زار بتا رہی تھی کہ وہ بہت مشکل میں ہے۔ آج میں اس کی مدد کرنے کے قابل ہو گیا تھا اور شاید یاسر نے بھی اس بات کو محسوس کر لیا مگر رخصت ہوتے وقت بھی اس نے مجھ سے کسی قسم کی مدد کا تقاضا نہیں کیا۔ اگلی مرتبہ وہ میرے بے حد اصرار پر میرے گھر آیا تو قدرے مختلف حلیے میں تھا۔ اس نے اپنی بیگم کے ساتھ نہ آنے پر معذرت کی اور ساتھ لائے ہوئے میرے بچوں کے لیے تحفے اور پھول میری بیگم کے حوالے کیے۔ میری بیگم نے پُرتکلف دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ ہم دونوں دوست بے تکلف ہو کر کھانے پر ٹوٹ پڑے اور پھر رات گئے تک باتوں میں مصروف رہے۔ پھر میں نے اگلے دن اسے فون کر کے اس کے آنے کا شکریہ ادا کیا اور اسے کہا کہ میں کسی پارٹ ٹائم کام میں دو چار لاکھ روپے لگانا چاہتا ہوں مگر اس نے بڑی سہولت سے انکار کر دیا۔ پھر ایک دفعہ میں نے اسے اپنے سامنے بٹھا کر کہا کہ اگر وہ کوئی مدد یا قرض وغیرہ چاہتا ہے تو میں اس کی مدد کرنے کو تیار ہوں مگر وہ فقط مسکرا کر رہ گیا۔

تب مجھے احساس ہوا کہ شاید یاسر کو قناعت کی دولت حاصل ہو گئی ہے۔ میں نے اپنی بیگم سے ذکر کیا تو اس نے کہا کہ اگر میں اپنے دوست کی مدد کرنا چاہتا ہوں تو اس کے کہنے کا انتظار کیوں کر رہا ہوں، خود آگے بڑھ کر اس کی مدد کیوں نہیں کر دیتا؟

یہ مشورہ مجھے مناسب لگا۔ یاسر جیسے خوددار اور ہمیشہ دوسروں کی مدد کرنے والے انسان کے لیے کتنا مشکل ہوگا کہ وہ کسی سے اپنے لیے مدد مانگے۔ میں نے یہ بات پہلے نہیں سوچی تھی۔ ایک دن میں یاسر کے گھر پہنچ گیا۔ اسے میری آمد پر بہت خوشی ہوئی اور اس نے مجھے کھانے پر روک لیا۔ کھانے کے بعد جب ہم تنہا ہوئے تو میں نے ایک چیک یاسر کی جیب میں ٹھونسا اور جلدی سے کہا: ''دیکھو یاسر! مجھے لگتا ہے کہ تم کچھ پریشان ہو اور مالی طور پر آسودہ نہیں۔ مجھے پتا ہے، یہ بات تمہیں پسند نہیں آئے گی مگر تم نے جس طرح ہمیشہ میرا ساتھ نبھایا، تمہیں اس حالت میں دیکھ کر اگر میں تمہاری مدد نہیں کروں گا تو میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہے گا۔''

یاسر کچھ کہتے کہتے رک گیا اور عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا: ''یاسر! ناراضگی والی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ کسی احسان یا

دوستی کی قیمت نہیں ہے۔ یہ بس ایک رقم ہے، جسے تم قرض سمجھ کر رکھ سکتے ہو۔''

یاسر نے چیک نکال کر دیکھا۔ وہ میرے دستخط والا سادہ چیک تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا: ''موسیٰ! میرے دوست، تمہارا بے حد شکریہ۔ بڑی مہربانی ہوگی مگر مجھے اس بات کے لیے مجبور مت کرنا!''

اس نے یہ کہہ کر چیک میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے چیک زبردستی اس کی جیب میں ٹھونسا اور قدرے ناراضگی سے بولا: ''اگر اب تم نے غیرت دکھائی تو ہماری دوستی ختم اور اگر تم نے یہ چیک استعمال نہ کیا، تب بھی......''

یاسر نیم رضا مند ہوگیا اور میں نے اسے سمجھا بجھا کر راضی کر لیا۔ میرے اکاؤنٹ میں پانچ لاکھ سے زائد رقم موجود تھی جو میری تنخواہ سے بچائے ہوئے روپے تھے۔ کچھ دن بعد بینک منیجر کا فون آیا کہ کیا وہ دو لاکھ کا چیک کلیئر کردے جو مسٹر یاسر اپنے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرانا چاہتے تھے......

مجھے حیرت کا جھٹکا لگا: ''دو لاکھ روپے......!''

منیجر نے چونک کر پوچھا: ''کیا آپ نے کسی کو بلینک چیک دیا ہے؟''

میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا، پھر آہستہ سے بولا: ''نہیں، آپ پلیز یہ چیک کلیئر کردیں۔''

میں نے کہہ تو دیا تھا مگر میرا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ مجھے اس بات سے بہت شاک لگا تھا۔ میں حیران تھا کہ یاسر نے اتنی بڑی رقم کیوں لکھی۔ اس نے مجھے اعتماد میں کیوں نہیں لیا۔ میں کوئی بہت امیر آدمی نہیں تھا اور میرے لیے دو لاکھ روپے کی بہت اہمیت تھی۔ مجھے فوری طور پر یہ احساس ہوا کہ یاسر نے اپنے احسانوں کی بہت زیادہ قیمت وصول کی تھی۔ یاسر کے متعلق میری بدگمانی بڑھ گئی۔ اس نے اگلے کئی روز تک مجھ سے رابطہ نہیں کیا تو میں سمجھ گیا کہ اس نے اپنا الو سیدھا کر لیا ہے اور اب اسے مجھ سے رابطہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس خوب صورت دھوکے پر ایک ڈراما لکھ کر جرم وسزا کی کہانیاں چلانے والے کسی نیوز چینل کو دوں اور اس کا نام رکھوں ''اعتماد کا خون۔''

دن پہ دن گزرتے گئے۔ میری بدمزاجی بڑھتی گئی۔ بے وقوف بن جانے کے احساس نے میرا خود پر اعتماد ختم کر دیا تھا اور میرے کام کی کارکردگی پر بھی اثر پڑنے لگا اور گھریلو تعلقات اور بچوں سے مراسم بھی خراب ہوتے چلے گئے۔ میں اس واقعے کو بھلانا چاہتا تھا مگر زخم تھا کہ بھرا ہی نہیں جا رہا تھا۔ میرے پُرسکون گھر کا ماحول خراب ہو چکا تھا اور میرے اندر سے خوش اخلاقی اور دوسروں کا خیال رکھنے جیسے لطیف جذبے ختم ہوتے جا رہے تھے۔

وہ ایک بوجھل اور بے کار دن تھا۔ یاسر اچانک مجھ سے ملنے چلا آیا۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ آج اس کے چہرے پر خوشی اور تازگی تھی۔ وہ مجھ سے بڑی گرمجوشی سے ملا اور مجھے زور زور سے بھینچنے لگا، یہ محسوس کیے بغیر کہ میرا ردِعمل کتنا سرد ہے۔ پھر اس کی خوشی کا راز کھل گیا۔ وہ اپنے سوتیلے بھائیوں سے کیس جیت گیا تھا۔ معاملہ عدالت عظمیٰ میں تھا اور فیصلہ یاسر کے خلاف ہوا تھا۔ اپیل کے لیے یاسر کے پاس مطلوبہ وسائل نہیں تھے۔ وہ سب کچھ بیچ کر پہلے ہی کیس پر لگا چکا تھا۔ اس کے وکیل کو کچھ نئی شہادتیں اور ثبوت ملے تھے اور وہ ایک بڑے وکیل کے ساتھ مل کر عدالت میں اپیل دائر کرنا چاہتا تھا مگر وہاں تک رسائی کے لیے یاسر کے پاس رقم نہیں تھی، تب یاسر کو میرا سادہ چیک ملا تو اس نے اسے غیبی مدد سمجھ کر آخری بازی کھیلی اور عدالت سے اپنا حق لینے میں کام یاب ہوگیا۔ تمام قانونی کارروائی اور جائیداد کی تقسیم کے بعد آج وہ یہ خوش خبری سنانے آگیا تھا۔

میری حالت عجیب سی ہوگئی۔ میں بدگمانی اور شک کا شکار ہو رہا تھا اور اپنے نیک دل دوست پر شک کرتا رہا۔ مجھے اس لمحے بہت شرمندگی ہوئی۔ یاسر کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ اس نے دو لاکھ کا چیک میری جیب میں ڈالا اور میرے گلے لگ گیا۔ مجھے بھی موقع غنیمت لگا اور میں نے بھی شرمندگی اور ندامت کے آنسو بہا دیے۔

میں سوچ رہا تھا کہ بدگمانی کتنا بڑا عذاب ہوتی ہے اور توکل اور سچائی کتنے خوب صورت اور توانا جذبے ہوتے ہیں۔

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے

نیر رانی شفق

''ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا کوئی بلبل تھا اداس بیٹھا
کوئی بلبل تھا اداس بیٹھا اداس بیٹھا............''

فرحان آنکھیں بند کیے مسلسل نظم یاد کرنے میں مصروف تھا۔

''رٹو طوطا بننے سے کام نہیں چلے گا چھوٹے!'' سلمان بھائی نے ہنس کر فرحان کے سنورے ہوئے بال بگاڑتے ہوئے کہا تو وہ جھنجھلا گیا۔ ''سلمان بھائی! کیا کروں؟ نظم یاد ہی نہیں ہو رہی۔ میرے ٹیچر نے خواہ مخواہ اتنی مشکل نظم میرے ذمہ لگا دی ہے۔''

''ارے، ارے! تم ناراض کیوں ہو رہے ہو؟'' سلمان بھائی نے اسے پچکارتے ہوئے کہا۔ کسی بچے میں کوئی گُن ہوتا ہے تو استاد اس کے ذمے کوئی کام لگاتے ہیں۔ ویسے بھی یہ نظم تو بہت آسان اور خوب صورت ہے، بس اس کا مفہوم اگر تم سمجھ لو تو یاد کرنے میں آسانی ہو جائے گی۔''

فرحان کچھ سوچتے ہوئے بولا: ''سلمان بھائی! کیا آپ کو اس کا مطلب آتا ہے؟''

''ہاں! بالکل آتا ہے مگر یہ بتاؤ کہ یہ نظم تم نے کب پڑھنی ہے؟'' ''سلمان بھائی! 9 نومبر کے حوالے سے ہمارے اسکول میں ''یومِ اقبالؒ'' منایا جا رہا ہے، یہ نظم اسی تقریب میں پڑھنی ہے۔''

فرحان ایک معروف پبلک اسکول میں جماعت نہم کا طالب علم تھا۔ وہ ذہین اور فرماں بردار تھا۔ اللہ نے اسے اچھی آواز دی تھی۔ وہ اکثر نعت خوانی اور ملی نغموں کے مقابلے میں اوّل پوزیشن حاصل کرتا تھا۔

اسی لیے اس کے استاد صاحب نے علامہ اقبالؒ کی مشہور نظم ''ہمدردی'' ترنم کے ساتھ پڑھنے کی ذمہ داری اسے دی تھی جب کہ دیگر بچے علامہ اقبالؒ پر تقاریر کر رہے تھے۔ سلمان بھائی جو خود بھی اپنے زمانۂ طالب علمی میں پُر جوش مقرر رہ چکے تھے اور علامہ اقبالؒ پر بے شمار تقاریر کرنے کے سبب نہ صرف ان کے بہت سے اشعار اور نظمیں انہیں زبانی یاد تھیں بلکہ علامہ اقبالؒ ان کی پسندیدہ شخصیت بھی تھے اور علامہ اقبالؒ کے متعلق انہیں بات کرنا ہمیشہ سے مرغوب رہا تھا۔ لہٰذا وہ پُر خیال انداز میں دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ بولے: ''ہوں...... وہ تو ٹھیک ہے مگر یہ تو بتاؤ کہ 9 نومبر کا دن ہمارے لیے کس حوالہ سے اہمیت رکھتا ہے؟''

فرحان پُر جوش انداز میں فوراً بولا: ''چھوٹے بھیا! یہ تو مجھے

معلوم ہے کہ 9 نومبر 1877ء کو علامہ اقبالؒ پیدا ہوئے تھے اور وہ ہمارے قومی شاعر بھی ہیں۔'' ''اوہ! میرے چھوٹو تمہیں تو سب معلوم ہے، اب یہ بتاؤ کہ علامہ اقبالؒ کے بارے میں مزید کیا جانتے ہو؟''

''باقی باتیں تو آپ بتائیں گے نا؟'' فرحان چالاکی سے مسکرا کر بولا تو سلمان بھائی ہنس دیے اور بولے: ''چلو ٹھیک ہے، میں تمہیں بتاتا ہوں کہ علامہ اقبالؒ 9 نومبر کو سیالکوٹ کے ایک دیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام صوفی نور محمد تھا۔ آپ کے آباء و اجداد کشمیری تھے۔ آپ بے انتہا ذہین اور فرماں بردار بچے تھے۔ پرائمری جماعت تک اپنی قابلیت کی بناء پر وظیفہ حاصل کیا۔ فرحان نے قطع کلامی کرتے ہوئے استفسار کیا: ''وظیفہ سے مراد اسکالرشپ؟ جس طرح جماعت ہشتم کے بورڈ کے امتحان میں مجھے اسکالرشپ ملا ہے۔''

''بالکل، بالکل۔'' سلمان بھائی ایک مرتبہ پھر کھلکھلا کر ہنس دیے اور اس کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے بولے: ''تم بھی ایک ذہین بچے ہو مگر اقبالؒ بننے کے لیے مزید محنت کرنا ہوگی۔'' یہ سن کر فرحان کے لبوں پر تبسم آ گیا اور جوشِ مسرت سے آنکھیں چمکنے لگیں۔

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔'' سلمان بھائی نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''علامہ اقبالؒ نے میٹرک کا امتحان بھی امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور مرے کالج سیالکوٹ میں داخلہ لے لیا۔ بعدازاں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے کیا۔ یہیں پر کچھ عرصہ نوکری بھی کی اور بالآخر مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے 1905ء میں یورپ کے لیے رختِ سفر باندھا۔ سلمان سانس لینے کے رکا تو فرحان فوراً درمیان میں بولا: ''لیکن بھیا! ان کے نام کے ساتھ تو ڈاکٹر لگتا ہے۔ تو کیا وہ ڈاکٹر نہیں تھے؟'' سلمان یہ سن کر ہنس دیا اور بولا: ''وہ ایم بی بی ایس ڈاکٹر نہیں تھے بلکہ انہوں نے پہلے کیمبرج یونی ورسٹی سے بارایٹ لاء کیا۔ پھر جرمنی کی میونخ یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اسی ڈگری کے باعث آپ کے نام کے ساتھ ڈاکٹر کا اضافہ ہوا۔'' ''مگر سلمان بھائی! وہ شاعری کس طرح کرتے تھے؟'' جو سوال فرحان کے ذہن میں بہت دیر سے ہلچل مچا رہا تھا بالآخر اس نے وہ سوال کر ڈالا۔

سلمان مسکرا کر بولا: ''فرحان! یہ تو اللہ کی طرف سے کسی بھی شخص کے لیے اضافی خوبی ہوتی ہے اور علامہ اقبالؒ بچپن ہی سے اس نعمت سے مالا مال تھے۔ ان کی شعر و شاعری کا شوق مسلمانوں کے بہت کام آیا۔ علامہ اقبالؒ نے آغاز میں نہ صرف روایتی شاعری کی بلکہ بچوں کے لیے بھی کچھ خوب صورت نظمیں لکھیں جو آج بھی نہ صرف اُردو ادب کا سرمایہ ہیں بلکہ زبان زدِ عام بھی ہیں۔ بعدازاں انہوں نے اپنی شاعری کو ملتِ اسلامیہ اور نوجوانوں کی اصلاح اور ذہنی بیداری کے لیے جس خوبی اور خلوص سے استعمال کیا، اس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔

ان کی شاعری کے جوہر نے سوئی ہوئی قوم کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر

دلوں میں آزادی کی وہ شمع روشن کی کہ جس کی روشنی چہار دانگ عالم میں پھیل گئی۔

آپ نے سب سے پہلے الٰہ آباد کے مقام پر 1930ء میں مسلم لیگ کے سالانہ جلسے میں علیحدہ وطن کا تصور دیا جسے ہندوؤں نے دیوانے کا خواب قرار دیا مگر بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ علامہ اقبالؒ کی عقابی نگاہوں نے نہ صرف پاکستان کا نقشہ دیکھا تھا بلکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہی ہندوستان کے مسلمانوں کی اصل تقدیر ہے۔"

"آج کے لیے بس اتنا۔" سلمان یہ کہہ کر اٹھنے لگا تو فرحان تیزی سے بولا: "مگر بھیا نظم کا مفہوم تو رہ گیا۔" "ہاں! چلو میرے جگر نظم کا مفہوم بھی بتا دیتا ہوں۔" سلمان اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گیا۔

"جیسا کہ تم جانتے ہو اس نظم کا عنوان "ہمدردی" ہے۔ یہ نظم اقبالؒ کے مجموعہ بانگِ درا میں شامل ہے جو کہ ایک انگریز شاعر ولیم کوپر کی نظم سے ماخوذ ہے۔

دراصل اقبالؒ حریت فکر، حرکت و عمل اور خودی و خودمختاری کے علم بردار تھے اور ان کے پیغام خودشناسی اور خودداری کا مقصد یہی تھا کہ وہ مسلمانوں خصوصاً نوجوانوں کے اندر نہ صرف درویشانہ بلکہ رہبرانہ اوصاف دیکھنا چاہتے تھے اور جگنو بھی دراصل حرکت و عمل اور ایک رہبر کی خصوصیت کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ ایک علامتی کردار ہے جو دوسروں کو روشنی دکھاتا ہے اور منزل تک پہنچاتا ہے۔

بلبل عیش و آرام کا قائل اُڑنے چگنے اور کھیل تماشوں میں وقت ضائع کرنے والا پرندہ ہے جب کہ جگنو میں دوسروں سے ہمدردی کا جذبہ ہے۔ اس کے اندر خودی کی روشنی ہے اور وہ انہی اوصاف کی وجہ سے بھٹکے ہوؤں کو روشنی دکھا کر ان کی منزل تک پہنچانے کا فریضہ انجام دیتا ہے۔

اس نظم کے ذریعہ اقبالؒ مسلمانوں کو خصوصاً نوجوانوں کو یہ بات بتانا چاہتے ہیں کہ زندگی محض کھیل تماشا نہیں ہے جو لوگ بلبل کی طرح فکر فردا نہیں کرتے اور محض وقت ضائع کرتے ہیں۔ وہ کبھی منزل تک نہیں پہنچ سکتے بلکہ آخر میں وہ صرف روتے اور پچھتاتے ہیں جب کہ مسلمان اس دُنیا میں اللہ کا نائب خلیفہ ہے۔

اس کا مقصدِ حیات، تسخیر ذات، تسخیر کائنات اور خدمتِ خلق ہے۔ رہبرِ کامل کی طرح ہمارا فرض ہے کہ خودی سے آشنا ہو کر اپنے اصل مقام کو پہچانیں۔ اپنا وقت فضول کاموں میں ضائع کرنے کے بجائے تعمیری کاموں میں لگائیں اور جگنو کی طرح بھٹکے ہوؤں کو ان کی منزل تک پہنچائیں۔ اقبالؒ نے اس نظم میں باطن کی روشنی سے کام لے کر جگنو کی طرح رہنمائی کا کام لینے کا درس دیا ہے۔

اب فرحان، سلمان بھائی کے ساتھ لہک لہک کر گانے لگا۔

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا — بلبل تھا کوئی اداس بیٹھا
کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی — اُڑنے چگنے میں دن گزارا
پہنچوں کس طرح آشیاں تک — ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا
سن کر بلبل کی آہ و زاری — جگنو کوئی پاس ہی سے بولا
حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے — کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا
کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری — میں راہ میں روشنی کروں گا

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے"

نظم پڑھ کر دونوں کھلکھلا کر ہنس دیے۔ سلمان بولا: "ایک بات اور، ہمدردی نیکی کا وہ جذبہ بھی ہے جس کی ہمارے دین میں بار بار تاکید کی گئی ہے۔ یعنی حقوق العباد کی ادائیگی، ایثار، اخوت اور محبت۔"

فرحان بولا: "سلمان بھائی! اب میں اچھی طرح سمجھ گیا کہ بحیثیت مسلمان نہ صرف کسی کی مشکل کشائی کرنا بلکہ اللہ کے نائب کی حیثیت سے رہنمائی اور رہبری کا فریضہ انجام دینے کے لیے ہمیں بھی جگنو کی طرح اپنے اندر بہترین روشن اوصاف پیدا کر کے ان سے کام لینا چاہیے۔" "بالکل ٹھیک سمجھے۔" سلمان خوش ہو کر بولا۔ فرحان اب اس بات پر عمل بھی کرنا کیونکہ یہی اقبالؒ کا خواب تھا اور یہی درس تو وہ اپنی شاعری میں ہم سب کو دیتے رہے۔"

"ان شاء اللہ بھیا! میں بھی جگنو کی طرح روشنی کر کے اپنی قائدانہ صلاحیتوں سے ملک و قوم کے کام آؤں گا۔" سلمان نے بے ساختہ فرحان کو گلے لگالیا۔

☆......☆......☆

اَلْمُعِزُّ جَلَّ جَلَالُہٗ (عزت دینے والا)

تعریف: اپنے حکم ماننے والوں کو دنیا میں عزت عطا فرماتا ہے، روزِ قیامت اپنی رحمت سے ان کو بخشش عطا فرمائے گا اور پھر ان کو ہمیشہ کے لیے اپنی جنت میں داخل فرمائے گا اور انہیں اپنے دیدار سے نوازے گا۔

تشریح: اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا: ''وہ جسے چاہے عزت دے، جسے چاہے ذلت دے۔''

دنیا کے لوگوں کے نزدیک عزت مال و دولت کا نام ہے۔ جس کے پاس زیادہ مال ہے یا بہت زیادہ دولت ہے۔ اس کے بنگلے ہیں، گاڑیاں ہیں تو وہ عزت والا ہے اور جو جھونپڑی میں رہتا ہے، غریب ہے، وہ ذلیل ہے۔ ہرگز ہرگز ایسا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ عزت والا وہ ہے جو گناہوں سے بچنے والا ہے۔

سب سے عمدہ قصہ

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بہت سارے قصے بیان فرمائے ہیں لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے کے بارے میں خود فرمایا کہ یہ سب سے عمدہ اور پیارا قصہ ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام اپنے سارے بھائیوں کے مقابلے میں زیادہ خوبیوں والے تھے۔ ان کے والد حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے اس بیٹے کی پیشانی سے پہچان لیا تھا کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے نبی ہوں گے۔ اس لیے وہ انہیں اپنے سے زیادہ قریب رکھتے تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کو ان سے حسد ہوگیا۔ ان بھائیوں کو حضرت یوسف علیہ السلام کا وجود برداشت نہ تھا۔ لیکن اللہ عزت اور ذلت کے مالک ہیں۔ وہ جسے عزت دینا چاہیں، اسے کوئی ذلیل نہیں کرسکتا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے بارہ بھائی تھے۔ ایک دن انہوں نے ایک خفیہ مشورہ کیا کہ اپنے والد یعقوب علیہ السلام کے دل سے اپنے بھائی یوسف کی محبت کیسے نکالیں۔ اگر محبت نہ نکال سکیں تو یوسف علیہ السلام کو (نعوذ باللہ) قتل ہی کردیں۔

لیکن ایک بھائی کہنے لگا: ''اگر کچھ کرنا ہے تو قتل نہ کرو، بلکہ کسی ویران کنویں میں ڈال دو۔ کوئی مسافر آکر نکال لے جائے گا۔''

حضرت یوسف علیہ السلام کے سب بھائی شیطان کی چال میں آگئے۔

یہ سارے بھائی اکٹھے ہوکر اپنے والد صاحب کے پاس آئے اور کہنے لگے: ''ہم سیر اور کھیل کود کے لیے جنگل میں جانا چاہتے ہیں اور اپنے ہمراہ یوسف کو بھی لے جانا چاہتے ہیں۔''

ان کے والد نے منع فرمایا تو کہنے لگے: ''ابا جان! آپ کو ہم

پر ذرا اعتماد نہیں؟ حالاں کہ ہم تو ان کے خیر خواہ ہیں۔"

حضرت یعقوب علیہ السلام سمجھ گئے کہ کچھ گڑبڑ ہے اور پھر فرمایا: "مجھے خوف ہے کہ تم اس کو اپنے ساتھ لے جاؤ، خود کھیل کود میں لگ جاؤ اور اسے بھیڑیا کھا جائے۔"

یہ سن کر وہ سب کے سب بول اٹھے: "ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ ہم سب کے ہوتے ہوئے ایک بھیڑیا اسے کھا جائے......!"

بہر حال وہ لوگ ان کو لے گئے اور جنگل میں لے جا کر ویران کنویں میں جہاں پانی نہیں تھا، ڈال دیا۔ واپسی پر روتے ہوئے حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس آئے اور کہنے لگے: "ابا جان! ہم آپس میں کھیل میں دوڑتے ہوئے آگے نکل گئے اور یوسف کو سامان کے پاس چھوڑ گئے۔ اچانک ایک بھیڑیا آیا اور یوسف کو اٹھا کر لے گیا۔" جھوٹ موٹ کسی جانور کے خون سے تر کی ہوئی یوسف علیہ السلام کی قمیص بھی پیش کی۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے دیکھا کہ قمیص خون میں لت پت تھی مگر کہیں سے ذرا سی بھی نہ پھٹی تھی۔ آپ نبی تھے، ان لوگوں کی چال کو سمجھ گئے اور کہا: "بات وہ نہیں ہے جو تم بتا رہے ہو بلکہ تم نے اپنے دلوں میں یہ بات گھڑ لی ہے اور میں تمہارے معاملے میں اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتا ہوں۔" یہ کہہ کر صبر اختیار کر لیا۔

ملک شام سے مصر کی طرف ایک قافلہ جا رہا تھا۔ ان کے راستے میں وہی کنواں آیا جس میں حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے ڈال دیا تھا۔ قافلے والوں نے پانی نکالنے کے لیے اپنا ڈول کنویں میں ڈال دیا۔ پانی تو کنویں میں تھا نہیں، اللہ تعالیٰ کی شان دیکھیے!

یوسف علیہ السلام نے ڈول دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا شاید میرے بھائیوں کے دل میں رحم آ گیا ہے اور وہ مجھے کنویں سے نکالنے آ گئے۔ یہ سوچ کر وہ اس ڈول میں بیٹھ گئے۔ اس ڈول کے سہارے جب باہر آئے تو قافلے والے خوش ہو گئے کہ پانی کی جگہ ایک غلام ہاتھ آ گیا ہے۔

قافلے والے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے ساتھ لے کر مصر پہنچے اور انہیں بازار میں فروخت کر دیا۔ بازار میں انہیں بادشاہ کے ایک بہت بڑے وزیر نے خرید کر اپنا بیٹا بنایا اور اپنے پاس رکھ لیا۔ وزیر نے حضرت یوسف علیہ السلام کی ایمان داری دیکھ کر کچھ ہی دنوں میں سارے کام ان کے سپرد کر دیے۔

اللہ تعالیٰ نے پرورش بھی کروائی اور حکومت کا انتظام بھی سکھا دیا۔ ترقی کرتے کرتے وہ وقت بھی آیا کہ وہ وزیر خزانہ بن گئے۔

ایک مرتبہ قحط پڑا تو ان کے بھائی غلہ لینے کے لیے شام سے مصر آئے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں دیکھ کر پہچان لیا اور ان کے ساتھ احسان کیا۔ غلہ بھی دیا اور اس کی قیمت بھی انہی کے سامان میں چھپا کر واپس کر دی۔ جب یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے انہیں پہچانا تو اس وقت انہیں بہت ندامت اور شرمندگی ہوئی۔

کہنے لگے: "بے شک ہم قصور وار ہیں، ہمارے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا فرما دیجیے۔" حضرت یوسف علیہ السلام نے ان سے فرمایا: "آج تم پر کوئی پکڑ نہیں، اللہ تعالیٰ تمہیں معاف فرمائے۔ اور وہ سب رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔" پھر حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والد اور سارے خاندان کو اپنے پاس بلا لیا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے تمام خاندان کو لے کر مصر پہنچ گئے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کا شاہانہ استقبال کیا۔

اب دیکھیے! ایک طرف تو حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے ذلیل کرنا چاہا لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو عزت عطا فرمائی، یہاں تک کنویں سے نکال کر مصر کے تخت تک پہنچا دیا۔

یاد رکھنے کی باتیں

1۔ عزیز ساتھیو! عزت کا مالک ایک اللہ تعالیٰ ہے۔ اسی سے عزت مانگی جائے۔
2۔ تمام بچوں اور بچیوں کو چاہیے کہ ایک دوسرے کی عزت کریں، دوسروں سے احترام سے پیش آئیں۔
3۔ اللہ تعالیٰ نے عزت، حضورؐ کے اسوۂ حسنہ پر چلنے میں رکھی ہے۔ ہم اخلاص سے اپنے پیارے نبیؐ کی زندگی کو اپنانے کی کوشش کریں، پھر دیکھیں اللہ تعالیٰ ہمیں کیسی عزت عطا فرماتا ہے۔

چنٹو، منٹو، پنٹو اور ونٹو آپس میں بہت ہی گہرے دوست تھے۔ ان کے یہ نام گلشن کالونی کی ایک پُروقار شخصیت انکل وقار نے رکھے تھے۔ چنٹو (اصل نام علی) کا قد دراصل تھوڑا چھوٹا تھا، اسی لیے اسے چنٹو کا نام دیا گیا۔ منٹو (اصل نام عمر) تھوڑا موٹا تھا اور سب میں عمر میں بھی بڑا تھا، اسی لیے منٹو کا نام دیا گیا۔ اسی طرح پنٹو (اصل نام عبداللہ) اور ونٹو (اصل نام احمد) دونوں جڑواں بھائی تھے، اسی لیے انہیں پنٹو اور ونٹو کا نام دیا گیا۔

چاروں بچے پڑھائی میں بھی اچھے تھے مگر ایک عادت ان میں ایسی تھی جس سے باقی سب بہت تنگ تھے، وہ دوسروں کو تنگ کرنا۔ انہیں دوسروں کو تنگ کر کے بہت سکون حاصل ہوتا تھا۔ ان کی اس عادت سے سارے محلے والے بہت عاجز تھے اور ہر وقت انہیں سمجھاتے رہتے تھے۔ ان چاروں کی انکل وقار سے بڑی دوستی تھی۔ انکل وقار بھی انہیں نصیحتیں کرتے نہ تھکتے مگر بے سود یہ چاروں انکل وقار کی ہر بات مانتے سوائے ایک بات کہ دوسروں کو تنگ کرنے سے باز نہیں آتے تھے۔

ایک دن شام کو یہ چاروں انکل وقار کے گھر میں تھے۔

چنٹو بولا: ”انکل آپ ہمیں پہاڑ اور گلہری والی کہانی سنائیں ناں! آپ نے کہا تھا۔“

”ہاں، سنائیں ناں پلیز!“ سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

”سناؤں گا، ضرور سناؤں گا۔ ایک نہیں بلکہ دو، دو کہانیاں سناؤں گا مگر تم سب کو مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔“ انکل بولے۔

”وہ کیا؟“ منٹو بولا۔

”وہ یہ کہ آئندہ آپ سب کسی کو تنگ نہیں کریں گے حتیٰ کہ ایک چیونٹی کو بھی نہیں۔“ انکل وقار پیار بھرے لہجے میں بولے۔ پنٹو (عبداللہ) کچھ سوچتے ہوئے بولے: ”انکل میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کسی کو تنگ نہیں کروں گا۔“

”شاباش!...... اور تم تینوں؟؟؟“ انکل وقار نے کہا۔

”جی! ہم بھی وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ کسی کو تنگ نہیں کریں گے حتیٰ کہ ایک چیونٹی کو بھی نہیں۔“ تینوں نے کہا۔

انکل وقار نے پُرمسرت لہجے میں کہا: ”اچھا تو سنو! ایک دفعہ

کا ذکر ہے کہ......"

اس وعدہ کا اثر بس کچھ ہی دن رہا۔ اس کے بعد پھر وہی شرارتیں شروع ہوگئیں۔

گلشن کالونی کی اس مہمند سٹریٹ میں ایک بی اماں بھی رہتی تھیں۔ ان کا ایک پوتا تھا جو بہت ہی چھوٹا تھا۔ ان کا بیٹا اور بہو ایک بم دھماکے میں جاں بحق ہو گئے تھے۔ بی اماں کو سب خالہ جان کہتے تھے۔ خالہ جان پہلے ایک اسکول کی پرنسپل تھیں۔ ان کی پنشن سے ہی ان کا گزارا ہو رہا تھا۔ ایک دن خالہ جان نے چنٹو اور منٹو کو اپنے پاس بلایا اور کہا:

"چنٹو اور منٹو! یہ ذرا بجلی کا بل تو بھروا آؤ۔"

"اچھا خالہ جان!" دونوں نے کہا۔

دونوں جا رہے تھے کہ راستے میں پنٹو اور ونٹو کرکٹ کھیلتے نظر آ گئے۔ ان دونوں نے بل وہیں چھوڑا اور کرکٹ کھیلنے لگ گئے۔ تھوڑی دیر بعد پکوڑے بیچنے والا آ گیا۔ انہوں نے گرم گرم پکوڑے خریدے۔ چونکہ پکوڑے گرم تھے اس لیے ان سے پکڑے نہ جا رہے۔ چنٹو نے بے دھیانی میں پکوڑے بل پر ہی رکھ دیے۔ یوں وہ بل کا صفحہ تیل لگنے سے خراب ہو گیا اور اس سخت گرمی میں بل نہ بھرنے کی وجہ سے خالہ جان کے گھر کی بجلی کاٹ دی گئی۔ جب انکل وقار کو اس بارے میں پتا چلا تو وہ بہت ناراض ہوئے۔ ان چاروں نے معافی مانگ کر بڑی مشکل سے انکل وقار کو منایا۔

ان کی جماعت میں ایک لڑکا امجد تھا جو بہت غریب تھا۔ اس کے ابو بچوں کے کھلونے بناتے تھے۔ غلیل بھی بناتے تھے۔ امجد کے بستے میں ہمیشہ ایک نہ ایک غلیل تو ضرور ہوتی تھی۔ جب منٹو اور پنٹو کو پتا چلا کہ اس کے بستے میں ایک غلیل ہے تو انہوں نے امجد سے کہا: "یار امجد! ہمیں اپنی غلیل سے کھیلنے دو پلیز۔"

"اچھا، کھیل لو مگر اس سے کسی بچے کو مارنا مت۔" امجد نے کہا۔ اسی وقت چنٹو اور ونٹو بھی وہاں آ گئے۔ انہوں نے بھی اس سے کھیلنے کی اجازت مانگی۔

امجد کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا کہ انہیں غلیل دے کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ وہ اس کا صحیح استعمال نہیں کریں گے۔ پھر وہی ہوا جو اس نے سوچا تھا۔

چنٹو نے منٹو اور پنٹو سے کہا کہ تم دونوں مجھے میدان سے پتھر جمع کر کے دینا اور میں پرندوں کو مارتا رہوں گا۔

"ٹھیک ہے، ہم تمہیں پتھر دیتے رہیں گے۔" منٹو اور پنٹو بولے۔ "اور ونٹو تم مجھے بتاتے رہنا کہ پرندے کہاں کہاں بیٹھے ہیں۔" چنٹو پھر بولا۔

"مگر چنٹو تمہیں پتا ہے کہ امجد نے منع کیا ہے کہ اس سے کسی کو مارنا نہیں ہے۔" اب کی بار ونٹو تھوڑا غصے میں تھا۔

"ارے یار ونٹو! پرندے بول سکتے ہیں کیا؟ امجد کو پتا ہی نہیں چلے گا۔" پنٹو بولا۔

"اور اگر امجد کو پتا لگ گیا تو؟"

"اور اگر امجد کو پتا لگ بھی گیا تو ہم کہہ دیں گے کہ ہم کھیل رہے تھے تو غلطی سے لگ گیا۔" منٹو بولا۔

اسی طرح انہوں نے کتنے سارے کوؤں کو زخمی کر دیا۔ انہیں پرندوں کو تنگ کرنے میں بڑا مزہ آ رہا تھا۔

کچھ بچوں نے جا کر پرنسپل کو شکایت لگا دی۔ پرنسپل صاحب کو بہت غصہ آیا۔ انہوں نے ان چاروں پر جرمانہ عائد کیا اور امجد کو غلیل اسکول لانے پر ڈبل جرمانہ عائد کیا گیا۔ یہ جرمانہ ادا کرنا امجد کے بس سے باہر تھا اسی لیے اسے مجبوراً اسکول چھوڑنا پڑا۔

اتنا سب کچھ ہونے کے بعد بھی وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے۔

چار سال بعد جب کالج پہنچے تو وہاں کا ماحول بہت ہی عجیب تھا۔ کالج میں ان کا دل پڑھائی میں نہ لگا۔ کالج میں امیر گھرانوں سے لڑکے آتے تھے مگر ان میں سے بیشتر لفنگے اور آوارہ تھے۔ ان کے ساتھ مل کر یہ چاروں بھی دوسری سرگرمیوں میں شامل ہونے لگے۔

یہ چاروں اب چنٹو، منٹو، پنٹو، ونٹو سے علی، عمر، عبداللہ اور احمد بن چکے مگر ان کے ان پیارے پیارے ناموں کا اثر ان پر سے ختم ہوتا جا رہا تھا۔ تقریباً روز ہی ان کے گھر والوں سے ان کی لڑائی ہوتی تھی۔ انہی لڑکوں کے کہنے پر ان چاروں نے گھر چھوڑنے کا ارادہ بھی کر لیا تھا مگر اس سے پہلے ان کی زندگی کو صحیح راہ پر چلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ صفت لڑکا بھیجا۔

شہزاد بھی اسی کالج میں پڑھتا تھا، جب وہ ان کو دیکھتا تو اسے بڑا دکھ ہوتا۔ اس نے دل ہی دل میں ارادہ کر لیا کہ ان کو راہ راست پر لائے گا اور امتِ محمدی ﷺ ہونے کے ناطے امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر عمل کروائے گا۔ اس نے کالج کے ایڈمیشن آفس سے ان کے گھر کا پتا لیا اور کالج کے بعد گلشن کالونی پہنچ گیا۔ وہاں اس کی ملاقات اتفاقاً انکل وقار سے ہو گئی۔ اس وقت انکل وقار بازار جا رہے تھے۔ شہزاد نے انکل وقار سے پوچھا:

''معاف کیجیے گا، کیا آپ مجھے علی اور عمر کا گھر بتا سکتے ہیں؟''

انکل وقار نے سنا تو بہت حیران ہوئے۔ انہوں نے شہزاد سے پوچھا: ''تم ان کو کس طرح جانتے ہو؟''

شہزاد نے کہا: ''میں ان کے کالج میں پڑھتا ہوں۔''

''کیا کوئی ضروری کام تھا؟'' انکل وقار نے پریشانی سے پوچھا۔ شہزاد نے انکل وقار کو ساری بات بتا دی۔ انکل وقار اس کی بات سن کر خوش بھی ہوئے اور پریشان بھی۔ خوش وہ شہزاد کے عزم اور حوصلے سے ہوئے اور پریشان وہ ان چاروں کی حرکتوں اور بُرے دوستوں کی صحبت سے۔

شہزاد نے انکل وقار سے کہا: ''انکل کیا آپ ان سب کو راہِ راست پر لانے کے لیے میری مدد کریں گے؟''

''ہاں ہاں! ضرور کروں گا۔'' انکل وقار بولے۔

''پکا، میرا مطلب سچی۔'' شہزاد نے خوش ہو کر کہا۔

''سچی۔'' انکل بولے۔

اگلے ہی دن انکل وقار اور شہزاد نے ان چاروں کے والدین سے میٹنگ کی اور اپنی ترکیب کے بارے میں بتایا۔ ان کے والدین اس ترکیب سے متفق ہو گئے مگر شہزاد نے ایک شرط رکھی۔

شہزاد: ''آپ سب کو مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔''

''وہ کیا؟'' عبداللہ اور احمد کے ابو نے کہا۔

''وہ یہ کہ آپ لوگ کسی اور کو میری اس ترکیب کے بارے میں نہیں بتائیں گے کیوں کہ میں نہیں چاہتا کہ میری اس ترکیب کے بارے میں کسی کو کچھ پتا چلے۔ میں ایک گمنام مسیحا کی طرح ان کو راہِ راست پر لاؤں گا۔'' شہزاد نے وضاحت کی۔

اگلے دن جب علی گھر پہنچا اس نے دیکھا کہ گھر میں بہت سارے لوگ آئے ہوئے ہیں اور ایک بارعب شخصیت انہیں بیان سنا رہی ہے۔ اس بیان کے الفاظ میں اتنی تاثیر تھی کہ وہ روئے بغیر نہ رہ سکا۔ آج پہلی بار اسے اپنے گناہوں پر ندامت ہو رہی تھی۔ اُدھر عبداللہ اور احمد کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ جب صبح وہ کالج پہنچے تو ان کے گروپ کے دوسرے لڑکوں نے اپنے ساتھ چلنے کو کہا:

''یار عمر! چل آج ہمیں ہزارہ ٹاؤن جانا ہے۔''

''نہیں، آج ہم میں سے کوئی بھی تمہارے ساتھ نہیں چلے گا۔'' عمر بولا۔

''مگر کیوں؟ آج کیا ہوگا؟''

''بس کہا نہیں جانا تو بس نہیں جانا۔'' علی نے غصے سے کہا۔

شہزاد یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی دوا کا کچھ اثر ہو رہا ہے۔ یہی ہدایت کا لمحہ تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس نے کالج کے بعد انکل وقار کو سب کچھ بتایا اور اپنی ترکیب کے دوسرے مرحلے پر عمل کرنے کو کہا۔

عمر رات کو جب سونے کے لیے لیٹا تو سو نہ سکا کیوں کہ ٹیلی ویژن کی آواز بہت اونچی تھی۔ وہ ٹیلی ویژن کے کمرے میں گیا تو اس نے دیکھا کہ ایک معروف ٹی وی چینل پر سورۃ الملک کی تلاوت ہو رہی ہے اور جو ویڈیو دکھائی جا رہی تھی اس میں قیامت کی ہولناکیاں بھی دکھائی جا رہی تھیں جس سے اس کا دل بہت ہی ڈر گیا۔ اسے اپنے گناہوں کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ اٹھا، وضو کیا اور سجدے میں گر گیا۔ کتنی دیر ہو گئی وہ سجدے میں گرا رہا اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہا۔ صبح کالج پہنچا تو علی، عبداللہ اور احمد نے عمر سے کہا کہ اب ہم ان لڑکوں کے ساتھ نہیں جایا کریں گے۔

آخر کار شہزاد اور انکل وقار کی ترکیب کارگر ثابت ہوئی۔

20 سال بعد: عمر ایک سماجی کارکن ہے اور دوسروں کی مدد کرتا ہے۔ احمد اور عبداللہ ایدھی ویلفیئر ٹرسٹ میں کام کرتے ہیں اور لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ علی ایک ایمبولینس چلاتا ہے اور خلقِ خدا کی خدمت کرتا ہے۔ انہیں غریبوں، محتاجوں اور مسکینوں کی مدد کرتے ہوئے دلی سکون ملتا ہے۔

☆☆

درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ قرآن پاک میں قل سے شروع ہونے والی کتنی سورتیں ہیں؟

i۔ دو سورتیں ii۔ تین سورتیں iii۔ چار سورتیں

2۔ مدینۃ النبی کا پرانا نام کیا ہے؟

i۔ نجد ii۔ یثرب iii۔ فارس

3۔ حضرت بری شاہ لطیف کا لقب کیا ہے؟

i۔ سید الاولیاء ii۔ بری امام iii۔ قطب الاولیا

4۔ سعودی عرب کا قومی نشان کھجور کے درخت کے ساتھ اور کیا چیز ہے؟

i۔ ایک تلوار ii۔ تلواریں iii۔ چار تلواریں

5۔ علامہ اقبالؒ کا پسندیدہ پھل کون سا تھا؟

i۔ انار ii۔ آم iii۔ خربوزہ

6۔ ”آزاد مجھ کو کر دے اور قید کرنے والے۔ میں بے زباں ہوں قیدی، تو چھوڑ کر دعا لے۔“ یہ شعر علامہ اقبالؒ کی کس نظم سے لیا گیا ہے؟

i۔ ماں کا خواب ii۔ بچے کی دُعا iii۔ پرندے کی فریاد

7۔ ظہر اور عصر کی نمازیں کہاں ملا کر پڑھی جاتی ہیں؟

i۔ میدان عرفات میں ii۔ منیٰ میں iii۔ مسجد نبویؐ

8۔ پاکستان نیچرل ہسٹری میوزیم کہاں واقع ہے؟

i۔ ٹیکسلا ii۔ لاہور iii۔ اسلام آباد

9۔ علامہ اقبال کی کون سی کتاب آدھی اُردو اور آدھی فارسی میں ہے؟

i۔ زبورِ عجم ii۔ ارمغانِ حجاز iii۔ پیامِ مشرق

10۔ پہلا ایٹم بم ہیروشیما (جاپان) پر کب گرایا گیا؟

i۔ جون 1943ء ii۔ اگست 1945 iii۔ ستمبر 1946ء

جوابات علمی آزمائش اکتوبر 2013ء

1۔ ابراہہ بن اشرام 2۔ دور سے سلام کرنا 3۔ حضرت علیؓ 4۔ پروٹین 5۔ حجازِ مقدس کا تحفہ 6۔ پچر 7۔ محمڈن کالج 8۔ شیر 9۔ نمک 10۔ ٹڈی

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

☆ قدر آغا، وزیر آباد (150 روپے کی کتب)

☆ ارینہ آفتاب، کراچی (100 روپے کی کتب)

☆ ثمرہ طارق بٹ، گوجرانوالہ (90 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی:

انیق اسد، اسلام آباد۔ سیف اللہ، قصور۔ عبداللہ شاہ، دریا خان۔ زینب محمود، گوجرانوالہ۔ حسنین شفیق، ٹیکسلا۔ اریبہ امجد، قصور۔ حدیقہ عارف، لاہور۔ شفق فاطمہ، راول پنڈی۔ سید محمد طلحہ، سیال کوٹ۔ محمد عبداللہ نیازی، بھکر۔ سید نقیب الفضل ہاشمی، راول پنڈی۔ کومل صادق چوہدری، گوجرانوالہ۔ راجہ فرخ حیات، پنڈ دادنخان۔ علیشہ اظہر، اسلام آباد۔ ماہ رخ آمنہ، چیچہ وطنی۔ فضا سکندر، سرگودھا۔ مریم سکندر، سرگودھا۔ اروئ معطر بیگ، گجرات۔ محمد حذیفہ انوار، جھنگ صدر۔ فاطمہ ضیاد، کراچی۔ فرقان شکیل، لاہور۔ حافظ عمیر بن عابد، حافظ آباد۔ عمر عابد سرگانہ سیال، جھنگ۔ محمد سعد الاسلام، اسلام آباد۔ محمد اسماعیل خان، لاہور۔ محمد بلال عباس، لاہور۔ انصر علی، وہاڑی۔ منیب عزیز، ڈیرہ اسماعیل خان۔ عاصمہ رمضان، سرگودھا۔ محمد زبیر عبیداللہ، شیخوپورہ۔ مریم سلیمان بٹ، گوجرانوالہ۔ حارث خان، ڈیرہ اسماعیل خان۔ محمد زین عظمت، گوجرانوالہ۔ بلال احمد قریشی، میاں والی۔ صفا رشید، کراچی۔ شہزادی خدیجہ شفیق، لاہور۔ اشمل افضل، لاہور۔ طیب خالد، لاہور۔ محمد عبداللہ ہاشم، لاہور۔ ذیشان احمد صدیقی، میاں والی۔ انیقہ فجر ظفر قریشی، میرپور آزاد کشمیر۔ عمیمہ عروج، ملتان۔ اسد علی انصاری، ملتان۔ حفصہ اعجاز، صوابی۔ وسیم اللہ خان، راول پنڈی۔ محمد مجیر خان، بھکر۔ اسماء محمد یونس، وزیر آباد۔ ثمر خان، بھکر۔ عائشہ ذوالفقار، لاہور کینٹ۔ عدیل امجد، جہلم۔

1- خود اس کو کب پڑھنا آئے
جو چاہو لکھ کر دکھلائے

2- ہر چیز کو جوڑے آپس میں وہ پگلی
ایک طرف سے موٹی ہے ایک طرف سے پتلی

3- ناک چڑھے اور پکڑے کان
بچو بولو ہے کون شیطان

4- نہ کچھ پیے نہ کچھ کھائے
دونوں ٹانگوں سے چلتا جائے

(صفا رشید، کراچی)

5- کالا گھوڑا سفید سواری
ایک کے بعد دوسرے کی باری

6- جس نے بھی وہ ساز بجایا
خود نہ سنا دوسروں کو سنایا

(عائشہ ادریسی، علی پور)

7- جس شے کو ہر دیس میں پایا
اس کی صورت ہے نہ سایہ

8- بات چھپے نہ اس سے اصلی
گن لے سب کی ہڈی پسلی

(عزہ مریم، اخلاص)

9- لال گائے لکڑی کھائے
پانی پیے اور مر جائے

10- ایک گز کا طول
کبھی کلی کبھی پھول

(محمد حذیفہ انوار، جھنگ)

راستہ ڈھونڈیے

چوہے کو بہت بھوک لگی ہوئی ہے لیکن پنیر کا ٹکڑا بہت دور پڑا ہوا ہے۔ اگر چوہا کم سے کم وقت میں اپنی غذا حاصل کرنا چاہے تو کون سا راستہ اختیار کرے گا؟

ہندسے ملائیں:

یہ ننھے میاں تو کندھے پہ کلہاڑا رکھے بڑے خوف ناک ارادوں سے جا رہے ہیں۔ پتا تو چلے انہیں تلاش کس شے کی ہے۔ ذرا ترتیب سے ہندسے تو ملایئے۔

- صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بعد خلیفہ ہارون الرشید قرآن پاک کے پہلے حافظ تھے۔
- سورۃ حشر میں غزوۂ بنونضیر کے واقعات بیان ہوئے ہیں۔
- لفظ "قُل" سے شروع ہونے والی کل پانچ سورتیں ہیں۔
- قرآن پاک کی رو سے بنی اسرائیل سب سے زیادہ نافرمان قوم تھی۔
- قرآن کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کو 9 معجزے عطا کیے گئے۔
- قرآن پاک کی سورۃ طلاق میں عورتوں کے متعلق مسائل بیان کیے گئے ہیں۔
- چاروں خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم قرآن پاک کی کتابت کرتے تھے۔

(محمد سلیم، ایبٹ آباد)

- نبی علیہ السلام کی ولادت باسعادت شفاء نامی خاتون کے ہاتھوں ہوئی۔
- نبی علیہ السلام کے پردادا کا نام ہاشم اور پردادی کا نام سلمہؓ تھا۔
- نبی علیہ السلام کے والد حضرت عبداللہؓ نے 25 برس کی عمر میں وفات پائی۔
- نبی علیہ السلام کے والد حضرت عبداللہؓ کی شادی کے وقت عمر 17 سال تھی۔
- نبی علیہ السلام جب سفر شام پر روانہ ہوئے تو اس وقت آپ علیہ السلام کی عمر 13 سال تھی۔
- حضرت جبرئیلؑ پہلی وحی لے کر نبی علیہ السلام کے پاس آئے۔
- حضرت ابو طالب کی وفات کے بعد ابولہب بنی ہاشم کا سردار بنا۔

(قدسیہ بانو، سیالکوٹ)

- روئے زمین پر مسجد الحرام سب سے پہلے معرض وجود میں آنے والی مسجد ہے۔
- جب تحویل کعبہ کا حکم آیا تو مسلمان دو رکعت نماز پڑھ چکے تھے۔
- خانہ کعبہ سے پہلے مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس تھا۔
- اسلام کے پہلے فوجی پرچم کا باقاعدہ رنگ سفید تھا۔
- عظیم مسلمان سپہ سالار طارق بن زیاد کو فاتح اسپین کہا جاتا ہے۔
- سلطان محمود غزنوی نے محمد بن قاسم کی برصغیر آمد کے تین سو سال بعد یہاں حملے شروع کیے۔
- دیبل پر حملہ کے وقت محمد بن قاسم کی فوج کی تعداد تقریباً چھ ہزار تھی۔
- عظیم فاتح "سلطان محمد فاتح" نے حضور علیہ السلام کی فتح قسطنطنیہ کی خواہش پوری کی۔
- نامور بزرگ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا مزار عراق کے شہر بغداد میں واقع ہے۔
- مشہور صوفی بزرگ ابراہیم بن ادھمؒ ملک بلخ کے بادشاہ تھے۔
- حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا تعمیر کروایا ہوا "بہشتی دروازہ" پاک پتن میں واقع ہے۔

(محمد انور جمیل، ملتان)

- حضرت علی ہجویری داتا گنج بخشؒ 400ھ میں پیدا ہوئے۔
- حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ آخری وقت اجمیر شریف میں قیام پذیر تھے۔
- شیخ سعدیؒ نے ایران میں سب سے پہلے غزل کو وجود عطا کیا۔
- انسانی جسم کے بال ایک سے زیادہ دھاتوں کے مرکب ہوتے ہیں۔
- انسانی دل ایک منٹ میں 72 مرتبہ دھڑکتا ہے۔
- گروپ او کا خون سب انسانوں کو دیا جا سکتا ہے۔
- ایک صحت مند جوان آدمی ایک منٹ میں 18 مرتبہ سانس لیتا ہے۔

(سارہ نثار، گجرات)

- انسانی دل کے دائیں حصے میں ناخالص خون ہوتا ہے۔
- عام حالات میں انسانی خون کا دباؤ 120/80 ہوتا ہے۔
- 100 اونس تمباکو کے خشک پتوں میں دو اونس نکوٹین ہوتی ہے۔
- معدے میں موجود غدود رطوبت گیسٹرک جوس خارج کرتے ہیں۔
- انسانی جسم کا عضو دماغ 90 فیصد پانی پر مشتمل ہوتا ہے۔
- جو لوگ رنگوں میں تمیز نہیں کر سکتے انہیں کلر بلائنڈ کہا جاتا ہے۔
- دنیا میں پہلا تبدیلی قلب کا آپریشن ڈاکٹر کرسچن برنارڈ نے کیا۔

(محمد اکمل، حیدر آباد)

ماموں وائی فائی اور موبائل چور

دروازے کی دستک پر دروازہ ماموں وائی فائی نے کھولا تھا۔انھوں نے دیکھا کہ ایک موٹی سی توند والے صاحب نے دروازہ بجایا تھا۔ وہ پہلوان نما شخص اُن کے گھر پہلی بار آیا تھا۔اس کے گال موٹے موٹے تھے، مونچھیں چھوٹی مگر بہت گھنی تھیں، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔اس کے گالوں کی بناوٹ ایسی تھی کہ لگتا تھا کہ ہنس رہے ہوں۔

''جی فرمایئے! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔''

''ارے میاں! مجھے اندر آنے دو گے تو میں تمھیں کسی خدمت کا موقع دوں گا نا!'' آنے والے صاحب نے ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے ماموں کو ایک ہاتھ سے پرے کر کے اندر داخل ہونے کی کوشش بھی کی مگر ماموں ایسی کچی گولیاں کب کھیلے ہوئے تھے کہ وہ کسی اجنبی کو گھر کے اندر داخل ہونے دیں۔

''اجی جانے کہاں سے آگئے ہیں آپ!'' ماموں نے چونک کر کہا۔''ایسے ہی کسی اجنبی کو اپنے گھر میں گھسنے دوں۔''

''اجنبی ی ی ی......'' وہ ایک دم چیخ کر بولے۔''میں اجنبی کب سے ہو گیا اور تم کون ہو؟''

''لو! یعنی میرے ہی گھر میں مجھ سے ہی سوال ...واہ بھئی واہ!'' ماموں دونوں ہاتھوں کو اِدھر اُدھر گھماتے ہوئے بولے۔

''ارے کون ہے؟ بیٹا! میرے پاس آؤ۔'' اندر سے کھانستے ہوئے ابن پودینہ نے پُکارا۔

''جی بابا! میں آیا۔'' اس نے نہایت اِنکساری سے کہا اور اندر جانے لگا۔موٹے پہلوان نے بھی اندر داخل ہونے کی کوشش کی لیکن ماموں نے دروازے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''ارے بھئی میں آیا ہوں ہنس مُکھ لکھنوی .....اور یہ لڑکا ہے کہ......'' اُس موٹے نے چلاّ کر کہا۔ اندر آواز سُن کر ابن پودینہ دروازے کی طرف آگئے۔

''تو تم ہو میرے دوست ہنس مُکھ.....'' ابن پودینہ نے اپنی عینک کو اوپر نیچے کرتے ہوئے کہا۔وہ اسے اچھی طرح پہچاننے کی کوشش میں کام یابی کے بعد اُس سے بغل گیر ہو چکے تھے۔''تم نے پچھلے دس سالوں میں کتنا وزن بڑھا لیا ہے میرے دوست!''

”یار کوئی خاص نہیں بڑھا سکا۔ صرف 40 کلو بڑھا ہے۔“

”چالیس کلو.وووووووووووو....“ ماموں نے چالیس پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”بیٹا! کہیں نظر مت لگا دینا۔ پچھلے ہفتے کی نسبت ایک کلو کم ہوا ہے وزن!“ وہ زور دار قہقہہ لگاتا ہوئے بولے۔

”اور سُناؤ کیسے آئے اس طرف!“

”یار! تمھارے شہر میں مشاعرے کی دعوت ملی۔ جب جہاز کا آنے جانے کا ٹکٹ ملے تو خوامخواہ کیوں نہ آتا۔“ وہ جھوم جھوم کر بتا رہے تھے۔”میں نے سوچا رہنے کے لیے تمھارے گھر کو رونق بخشوں۔“

”اچھا کیا تم نے.....“ اُنھوں نے اداسی سے کہا۔ اب اُنھیں یہ فکر لاحق ہوگئی کہ ان کے کھانے پینے کا بندوبست بھی کرنا ہوگا۔ ان کا تو خود اُدھار پر گزارہ تھا۔

”یہ لڑکا کون ہے.....؟“ ہنس مکھ نے ماموں کے کاندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

”یہ میرا بیٹا ہے۔“ یہ کہہ کر انھوں نے تفصیلات بتانا شروع کیں۔

”بیٹا! آج صبح سے کوئی اچھی چیز کھانے کو نہیں ملی۔ بہت بھوک لگی ہے۔“ انھوں نے اپنے موٹے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔”اگر پوریاں کھانے کو مل جائیں تو کیا ہی کہنے۔“

”اچ چ چ چھ......“ وہ ایک دم چڑ کر بولے۔”آپ کے لیے تو کوئی دو تین کلو تولا نا ہوں گی پوریاں۔“

”نہیں بھئی! اتنا تکلف مت کرنا، میں دس بارہ پوریاں کھاؤں گا۔ پرہیز چل رہا ہے میرا، کوئی آدھا کلو حلوہ لے لینا۔“

ماموں نے ابن پودینہ سے اُن کی خواہش کا جواب آنکھوں ہی آنکھوں میں لیا۔ پھر انھوں نے گرین سگنل دیا تو ماموں نے گھر سے باہر نکلنے میں دیر نہیں لگائی۔

ماموں وائی فائی نے اپنی جیب چیک کی تو اس میں 50 روپے تھے۔ ان روپوں تین آدمیوں کا ناشتہ کرنا دشوار تھا۔ وہ مسئلے کا حل سوچ ہی رہے تھے کہ سامنے سے خالو نصیر آتے نظر آئے۔ قبل اس کے کہ وہ انھیں آواز لگاتے، وہ خود ہی ان کے پاس آگئے۔

”بیٹا! تم تو جانتے ہی ہو کہ میرا بیٹا فرقان کئی ماہ سے دبئی چلا گیا ہے۔“ ”جی جی!“ وہ بولے۔

”میں سو روپے کا کارڈ ڈالتا ہوں تو صرف 5 منٹ بات ہوتی ہے۔“

”ہوں!“ وہ ان کے اگلے جملے کے منتظر تھے۔

”مجھے معلوم ہے کہ تم وائی فائی کے ماسٹر ہو اور مفت میں پوری دُنیا میں بات چیت کر لیتے ہو۔“

”آپ میری بھی جاسوسی کرتے ہیں کیا خالو؟“

”نہیں بیٹا! میں نے تو لوگوں سے ایسا ہی سنا ہے۔“

”سنا تو آپ نے ٹھیک ہے لیکن بات یہ ہے کہ اس میں کچھ آپ کو خرچ کرنا پڑے گا۔“ وہ خالو سے پوریوں کے روپے نکلوانے کا منصوبہ بنا چکے تھے۔

”فکر مت کرو بیٹا! دس بیس روپے دے دوں گا تمھیں...“

”میں کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہوں کہ دس روپے سے بہل جاؤں گا۔ آپ سو روپے دیں تو میں بیس منٹ آپ کی بات کرا دوں گا۔“ اس نے اِٹھلاتے ہوئے کہا۔ خالو نے تھوڑا سا نخرا کر کے بات مان لی۔

☆☆

ماموں نے سو روپے جیب میں رکھے اور خالو کو لے کر ایک فور اسٹار ہوٹل کے پاس آگئے اور اپنے موبائل پر وائی فائی کے سگنل سمیٹنے کی کوشش کرنے لگے۔ کچھ دیر میں انھیں کام یابی ہوگئی۔ انھوں نے اسکائپ پر رابطہ کر کے خالو کا مطلوبہ نمبر ملا دیا۔ کال لگ گئی تو انھوں نے موبائل خالو کے حوالے کر دیا اور خود اِدھر اُدھر ٹہلنا شروع کر دیا۔ وہ ہوٹل کے شاپنگ مال کی دکانوں کے اطراف کا جائزہ لے رہے تھے۔ ان کے پاس وقت گزاری کے لیے بیس منٹ تھے۔

ماموں نے کچھ دکانوں میں سودے ہوتے دیکھے۔ ایک دکان پر ان کی نظریں حیرانی سے گڑ گئیں۔ جانے انھیں ایسا کیوں محسوس ہوا کہ یہاں کوئی گڑ بڑ ہونے والی ہے۔ یہ ایک موبائل شاپ تھی۔ ایک مرد اور ایک عورت موبائل فون دیکھنے میں مصروف تھے۔ دکان دار انھیں شوکیس سے سیٹ نکال نکال کر دکھا رہا تھا۔ مرد سیٹ ہاتھ میں لیتا اور اس کے بعد اس عورت کو دیتا تھا۔ وہ سیٹ کو تھوڑا بہت چلا کر دیکھتی اور پھر چہرے پر اظہار ناپسندیدگی کے بعد واپس کر دیتی۔ جانے ماموں کو اس کام میں کیا دل چسپی نظر آئی کہ وہ خالو نصیر اور اپنے موبائل کو تو بالکل بھول گئے اور نظریں وہیں گاڑ دیں۔

ان کا اندازہ شاید درست ہی تھا کیوں کہ انھوں نے دیکھا کہ

دکان دار جیسے ہی ایک سیٹ ان کے ہاتھ میں دے کر نیچے کی طرف جھک کر شوکیس سے کوئی اور موبائل نکالنے لگا تو اس عرصے میں اس عورت نے کمال ہوشیاری سے ہاتھ میں موجود فون پرس میں ڈال لیا۔اس کے بعد اس عورت نے جھوٹ موٹ دوچار موبائل دیکھے اورمنہ بناتی رہی اور آخر دکان سے باہر آگئی۔

اب موقع تھا، ماموں کے لیے کام دکھانے کا۔

''کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟'' انھوں نے سوچتے ہوئے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ان کی نظر خالونصیر کی طرف گئی تو، وہ سگنل چلے جانے کے باعث کبھی فون کو اور کبھی ماموں کی طرف پریشانی سے دیکھ رہے تھے۔ماموں کو خطرہ ہوا کہ کہیں وہ ان کے موبائل کو نہ بگاڑ دیں اس لیے وہ دوڑ کر اُن تک پہنچے۔

''ہوگئی نا خالوتسلی سے بات!'' انھوں نے فون اُن کے ہاتھ سے لے لیا۔وہ ان سے جان چھڑا کر اپنے کیس کی طرف جانا چاہ رہے تھے۔

''بیٹا! پوری بات کہاں ہوئی ہے صرف 18 منٹ بات ہوئی ہے۔ ابھی دومنٹ باقی تھے کہ سگنل چلے گئے ، جلدی ملاؤ پھر.....'' خالوبھی 100 کے نوٹ کا پورا مزالینا چاہ رہے تھے۔

''پھر بات کرا دوں گا خالو! ابھی مجھے جلدی ہے۔'' یہ کہہ کر ماموں نے فون جلدی سے جیب میں رکھا اور آگے بڑھ گئے، وہ عورت غائب ہو چکی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ اُس دکان دار کو بتا کر اسے پکڑوائیں گے لیکن اب پہلا مرحلہ اس کی تلاش تھا۔ وہ وہاں سے قریبی بازار کی طرف چلے۔ انھیں کچھ دیر میں وہ دونوں، مرد اور عورت تیز تیز قدم اُٹھاتے بازار کے بیرونی حصے کی طرف جاتے نظر آئے۔ ماموں نے بھی اسپیڈ بڑھا دی۔

''اگر میں دکان دار کی طرف واپس گیا تو یہ جا چکے ہوں گے اور اگر میں انھیں روکتا ہوں تو کیا کہوں۔'' ان کی سوچ درست تھی، ایسے میں ان کے لیے خدائی امداد موصول ہوگئی۔ انھیں سڑک کے ایک طرف ایک پولیس وین کھڑی نظر آگئی۔ انھوں نے دوڑ کر اے ایس آئی جلدی جلدی سمجھایا۔

''اوہ! ہمارے علاقے میں کھلے عام واردات.... وہ بھی ہمارے ہوتے ہوئے....'' اے ایس پی نے ڈکار لیتے ہوئے کہا۔ اسے تازہ تازہ کسی دکان دار نے بوتل پلا کر خوش کیا تھا۔

''چلو! آؤ میرے ساتھ!'' بس پھر کیا تھا ۔ وہ فوراً آگے بڑھے۔ ماموں نے عورت کی طرف اشارہ کیا۔اے ایس آئی نے فوراً آگے بڑھ کر اُن دونوں کو روک لیا۔

''آپ کے پرس میں ایک قیمتی موبائل ہے گا۔'' وہ معنی خیز نظروں سے دیدے اِدھر سے اُدھر گھماتا ہوا بولا۔

"ہاں ہے گا! پھر اس سے مطلب؟" عورت نے بھی غصے سے کہا۔
"ہمیں پتا چلا ہے کہ آپ نے ایک شریف دکان دار کو بے وقوف بنایا ہے۔" "کیا مطلب؟" وہ عورت چونک کر بولی۔
"ہمیں اس لڑکے نے سب کچھ بتا دیا ہے کہ کس طرح آپ نے موبائل شاپ سے فون پار کیا۔" اے ایس آئی مسکرا کر بولا۔ "اب پرچہ تو بنے گا۔"
"کیا بات کر رہے ہیں آپ! ہم شریف شہری ہیں۔" اب کی بار مرد بولا تھا۔
"ہر مجرم پکڑے جانے کے بعد یہی کہتا ہے آنٹی!" اب کی بار ماموں نے بھی چپ رہنا مناسب نہ سمجھا۔ ماموں کی آواز سن کر کچھ لوگ جمع ہو گئے اور انھوں نے انھیں داد دینا شروع کر دی۔ وہ جوڑا شرمندہ ہو گیا۔
"پلیز! آپ کو ہمارے ساتھ اس دکان دار تک چلنا ہوگا میڈم!" پولیس والے نے بھی عوام کو دیکھ کر اپنے اخلاق درست کر لیے۔ اسے معلوم تھا کہ بھیڑ بھاڑ ہونے پر میڈیا والے بھی آنے میں دیر نہیں لگاتے۔ ان کا کردار چینلوں پر جس انداز سے دکھایا جاتا ہے یہ اسے منظور نہ تھا۔
عورت اور مرد نے سوچا کہ اس طرح ان کی بیچ چوراہے پر بے عزتی ہو، اس سے بہتر ہے کہ دکان پر جا کر معاملے کو حل کر لیا جائے۔ یہی سوچ کر وہ ماموں اور اے ایس آئی کے ساتھ دکان کی جانب چل دیے۔ لوگوں نے ان کے ساتھ چلنے کی کوشش کی لیکن سپاہیوں نے ڈنڈے دکھا کر انھیں وہاں سے ہٹا دیا۔ یوں اس جوڑے کی تسلی ہوگئی۔
"ارے آیئے صاحب!" دکان دار نے جب پولیس والوں کو دیکھا تو خوش دلی سے ان کا خیر مقدم کیا۔ "یہ لوگ آپ کے ساتھ کیوں ہیں؟" اس نے جب اس جوڑے کو بھی ان کے ساتھ دیکھا تو چونک کر بولا۔
"دراصل انھوں نے آپ کی دکان سے ایک موبائل سیٹ اُٹھایا ہے۔"
"پرسوں بھی میری دکان سے ایک قیمتی سیٹ چوری ہوا تھا۔" وہ کچھ زیادہ ہی بھولا آدمی تھا۔ "اکیلا آدمی ہوں ناں...." وہ منہ کھول کر ہونقوں کی طرح بولا۔
"لیکن ہم نے ایسا کچھ نہیں کیا۔" وہ عورت تھوک نگلتے ہوئے بولی۔ "یہ ہم پر الزام ہے۔"
"ابھی سب کلیئر ہو جائے گا۔ آپ ذرا پرس سے وہ سیٹ تو نکالیے۔" ماموں نے اپنی شان بڑھانے کے لیے کہا۔
"ہاں، یہ لو دیکھ لو۔" وہ چڑ کر بولی اور اپنے پرس سے فون نکال کر شوکیس پر رکھ دیا۔ ماموں پہچان گئے کہ یہ وہی سیٹ تھا جو اس عورت نے موقع پا کر پرس میں ڈال لیا تھا۔
اے ایس آئی نے بھی بڑا سا قیمتی موبائل پرس سے برآمد ہوتے دیکھا تو خوش ہو گیا۔ اب دکان دار سے اسے خرچی ضرور ملتی۔
"تو یہ کام کرتی ہیں میڈم آپ!" اس نے طنزیہ انداز میں انھیں لتاڑا۔
"آپ دیکھ لو بھائی! یہ فون پچھلے ہی ہفتے میں نے آپ کی شاپ سے خریدا تھا۔ میرے پاس اس کی رسید بھی ہے۔" اس نے پرس کی جیبیں ٹٹولتے ہوئے ایک بل دکان دار کے آگے رکھ دیا۔
دُکان دار نے رسید دیکھی جو اس کے اپنے ہاتھ کی تھی۔ سیٹ اُٹھا کر دیکھا، واقعی وہی تھا جو اس نے بیچا تھا۔ پھر اُسے یہ بھی یاد آ گیا کہ آج اس قسم کا کوئی موبائل اس کی دکان پر تھا ہی نہیں تو پھر چوری ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔
"یہ خاتون ٹھیک کہہ رہی ہیں سر! یہ تو ہماری دکان کی خریدار ہیں۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "آپ نے ناحق پکڑا۔"
"میں نے تو ایک میسج پڑھ کر اپنا موبائل پرس میں ڈالا تھا۔ مجھے کیا پتا کہ اس گنجے لڑکے نے مجھ سے کوئی دشمنی نکالنا تھی۔"
اب اس خاتون کا سارا نزلہ ماموں پر گرنا تھا۔ وہ بڑبڑانے لگی۔
جب اے ایس آئی کو ان سے معذرت کرنا پڑی تو اُس کا بھی سارا غصہ ماموں کی طرف منتقل ہو گیا۔
"بچو! اب چائے پلاتے ہو یا لے چلوں بے گناہوں کو پھنسوانے کے الزام میں تھانے۔"
اور ایک گھنٹے کی محنت سے کمائے ہوئے اُن کے سو روپے انھیں چائے پلانے میں صرف ہو چکے تھے اور اب وہ سوچ رہے تھے کہ مسٹر ہنس مکھ کو حلوہ پوری کیسے کھلائیں؟
☆☆

۱۔علامہ اقبالؒ کی والدہ محترمہ کا کیا نام تھا؟ ۲۔ حضرت یوسفؑ کے کتنے بھائی تھے؟

۳۔ضرب المثل کہانی میں کس نے چور کو پکڑنے کی کوشش کی؟ ۴۔ المعز کا کیا مطلب ہے؟

۵۔آج کا مقبول کھیل اسکوائش کس قدیم کھیل کی تبدیل شدہ شکل ہے؟ ۶۔دُنیا کا طویل القامت سفیدے کا درخت کہاں ہے؟

درج بالا سوالوں کے جوابات نومبر 2013ء کے شمارے میں موجود ہیں۔آپ رسالہ غور سے پڑھیے اور اپنے جوابات لکھ بھیجیے۔ درست جواب دینے والے تین خوش نصیبوں کو 300 روپے کی انعامی کتب دی جائیں گی۔ تین سے زیادہ درست حل آنے کی صورت میں بہ ذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جائیں گے۔

اکتوبر 2013ء میں بہ ذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کے نام:

1۔ ولید اشرف، گوجرانوالہ | 2۔ حیدر علی رانا، سرگودھا | 3۔ سفینہ عثمان، گوجرانوالہ

کھوج لگایئے

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10/نومبر 2013ء ہے۔

نام: ____________

شہر: ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

آیئے عہد کریں

کوپن ارسال کرنے کی آخری تاریخ 10/نومبر 2013ء ہے۔

نام ____________ مقام ____________

میں عہد کرتا/کرتی ہوں کہ ____________

موبائل نمبر: ____________

سوال یہ ہے کہ......!

کوپن ارسال کرنے کی آخری تاریخ 10/نومبر 2013ء ہے۔

نام ____________ عمر ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

دماغ لڑاؤ

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10/نومبر 2013ء ہے۔

نام: ____________

مقام: ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

ہونہار مصور

موضوع ارسال کرنے کی آخری تاریخ 08/نومبر 2013ء ہے۔

نام ____________ عمر ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

میری زندگی کے مقاصد

کوپن پُر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام ____________ شہر ____________

مقاصد ____________

موبائل نمبر: ____________
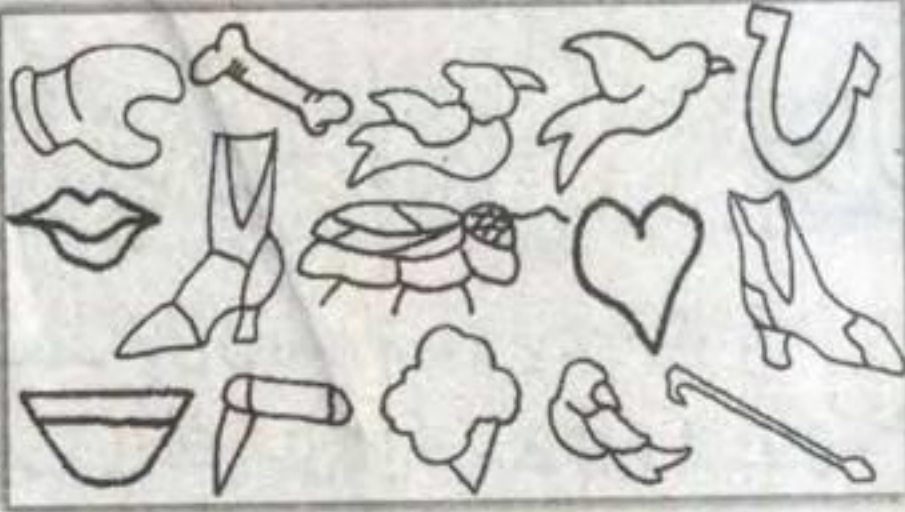
یہ چیزیں خاکے میں چھپی ہوئی ہیں۔ آپ ان چیزوں کو تلاش کیجئے اور شاباش لیجئے۔

کہتے ہیں کہ بچے کی تعلیم و تربیت میں بنیادی اور سب سے اہم کردار ایک ماں کا ہوتا ہے۔ گویا کہ کردار سازی ماں کی تربیت کی ہی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ علامہ اقبالؒ جیسی شخصیت کی تربیت ایک عظیم خاتون کا ہی کام تھا۔

علامہ اقبالؒ کے والد کی شادی سمبڑیال ضلع سیال کوٹ کے ایک کشمیری گھرانے میں ہوئی تھی۔ علامہ اقبال کی والدہ محترمہ کا نام ''امام بی بی'' تھا۔ یہ خاندان اٹھارہویں صدی کے آخر میں جنت نظیر وادیٔ کشمیر سے آ کر سیال کوٹ میں رہائش پذیر ہو گیا۔

آسماں تری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہ بانی کرے

علامہ اقبال کی مشہور کتاب ''بانگِ درا'' کی ایک طویل نظم ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' کا درج بالا آخری شعر ہے جو انہوں نے اپنی والدہ کی وفات کے بعد ان کی یاد میں کہی تھی۔ ایک ایسی ماں کے بارے میں جس نے محلہ چوڑی گراں (سیال کوٹ) کے ایک منزلہ مکان میں 9 نومبر 1877ء بروز جمعہ ایک بچے کو جنم دیا جس کا نام محمد اقبال تھا، مگر ماں ہمیشہ اسے پیار سے ''بالی'' کہا کرتی تھیں۔ ناخواندگی کے باوجود اپنے بچے کی اعلیٰ تربیت کی اور اس کے اندر ایک ایسی اٹھان پیدا کی کہ آج دُنیا اسے ایک شہرۂ آفاق مفکر، اُردو فارسی میں ملتِ اسلامیہ کے قومی شاعر، تصور پاکستان کے داعی اور ایک معروف قانون دان کے طور پر جانتی ہے۔

علامہ اقبال کی والدہ محترمہ امام بی بی اپنے خاندان میں ''بے جی'' کے نام سے پکاری جاتی تھیں۔ گو وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتی تھیں مگر صوم و صلوٰۃ کی پابند تھیں۔ وہ 1834ء میں سیال کوٹ کے نزدیکی قصبے سمبڑیال میں پیدا ہوئیں۔ انتہا وضع دار خاتون تھیں۔ سارا محلّہ ان کے اچھے سلوک کا گرویدہ تھا۔ دیانت داری کا یہ عالم تھا کہ محلے کی عورتوں کی اکثریت اپنے زیورات اور دیگر قیمتی چیزیں بطور امانت ان کے پاس رکھواتی تھیں۔ محلے یا برادری کے لوگوں میں خواتین کے درمیان لڑائی جھگڑا بڑھ جانے کی صورت میں بے جی کو بطور ثالث مقرر کیا جاتا اور ان کے فیصلے کو متفقہ طور پر قبول کیا جاتا۔ بے جی غریب و نادار عورتوں کی خفیہ طور پر امداد بھی کرتی تھیں۔ ایک دو بار ایسا بھی ہوا کہ غریب خاندانوں کی بچیاں اپنے گھر لے آئیں۔ بچیاں گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹاتیں اور بے جی

کی بہو، بیٹیوں سے قرآن مجید، نماز، ابتدائی دینی تعلیم، اُردو لکھنا پڑھنا، کھانا پکانا اور سلائی کڑھائی سیکھتیں۔ پھر جب وہ جوان ہو جاتیں تو مناسب رشتہ دیکھ کر ان کی شادیاں کرواتیں۔ جتنا عرصہ وہ بچیاں ان کی تحویل میں رہتیں، ان کی دیکھ بھال ایسے ہی کرتیں گویا کہ انھی کی بیٹیاں ہوں۔ شادی کے وقت بھی بیٹیوں کی طرح ہی رخصت کرتیں اور پھر شادی کے بعد وہ بچیاں بے جی کے ہاں ایسے ہی آیا کرتیں، جیسے میکے آتی ہیں۔ بے جی ناخواندہ ہونے کے باوجود سمجھ داری اور فہم و فراست سے برادری کے خاندانی جھگڑے نہایت خوش اسلوبی سے حل کرا دیتی تھیں۔

بے جی، اپنے بیٹے اقبال سے بے حد پیار کرتی تھیں۔ علامہ اقبال بھی ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ جب علامہ اقبال اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ تشریف لے گئے تو وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر بیٹے کی خیر و عافیت سے وطن واپس لوٹنے کی دُعائیں مانگتی رہتی تھیں۔ ان کے خط کا بے چینی سے انتظار کرتی تھیں۔ علامہ اقبال نے بھی اپنی شخصیت پر والدہ کے اثرات کو شدت سے محسوس کیا۔ گرمیوں میں جب عدالتیں بند ہو جاتیں تو وہ والدہ محترمہ سے ملنے سیال کوٹ تشریف لے جاتے۔ علامہ فرماتے ہیں کہ جب سیال کوٹ پہنچ کر وہ اپنی والدہ کا دیدار کرتے تو وہ خوشی سے پھولے نہ سماتیں اور مجھے دیکھتے ہی کہتیں۔ ''میرا بالی آ گیا۔'' اس وقت میں خود کو ان کے سامنے ننھا منا سا بچہ محسوس کرتا۔

جولائی 1908ء میں جب علامہ اقبال یورپ میں اپنے تین سالہ قیام کے بعد لاہور پہنچے تو ریلوے اسٹیشن پر ان کے احباب استقبال کے لیے موجود تھے۔ شیخ گلاب دین نے ان کے اعزاز میں دعوت کا اہتمام کیا تو سر محمد شفیع نے ان کی شخصیت اور شاعری کے متعلق تقریر کی اور ان کی آمد کی خوشی میں نظمیں پڑھیں۔ اس تقریب کے بعد اسی شام گاڑی سے اقبال سیال کوٹ پہنچے۔ وہاں بھی پلیٹ فارم ان کا استقبال کرنے والوں سے بھرا ہوا تھا۔ اقبال کے والد، بھائی اور دیگر رشتے دار موجود تھے۔ ہاروں سے اقبال کا چہرہ تک چھپ گیا مگر اقبال کو گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ بڑی مشکل سے اسٹیشن سے گھر پہنچے اور گذشتہ تین سالوں سے منتظر اپنی ماں سے محبت سے لپٹ گئے۔ یہ ماں کی کشش ہی تھی جو انہیں چھٹیوں میں سیال کوٹ لے جاتی تھی۔ وہاں گھر کے زنان خانے میں ہر روز دوپہر کے کھانے سے پہلے یا بعد میں خوب محفل جمتی تھی۔ اس محفل میں اقبال کی والدہ بے جی، اقبال کی بہنیں اور بھابھی بھی شریک ہوتیں۔ اقبال ماں کی محبت میں ان سب کے ساتھ تختوں کے فرش پر بیٹھ جاتے اور گفتگو میں حصہ لیتے تھے۔

یہ 1914ء کا سال تھا۔ بے جی بڑھاپے کی وجہ سے خاصی کمزور ہو چکی تھیں۔ گزشتہ چند برسوں میں وہ کسی نہ کسی وجہ سے بیمار رہتی تھیں۔ دردِ گردہ کی تکلیف الگ سے تھی۔ ایک عرصے سے وہ روزہ رکھنے سے بھی معذور ہو چکی تھیں اور ہر سال فدیہ رمضان دیتی تھیں۔ ایک روز موسمی بخار سے طبیعت زیادہ بگڑ گئی۔ بخار کی شدت بڑھی تو قوتِ مدافعت بھی جاتی رہی اور چارپائی سے جا لگیں۔ گھر کے تمام افراد کے ساتھ علامہ اقبال بے حد فکر مند ہو گئے۔ وہ چاہتے تھے کہ بے جی کو علاج کے لیے لاہور لے جائیں مگر بے جی کسی حالت میں بھی سیال کوٹ چھوڑنے کو تیار نہ تھیں۔ چنانچہ جیسا ممکن ہوا سیال کوٹ میں ہی علاج معالجہ ہوتا رہا مگر کمزوری ختم ہونے کی بجائے بڑھتی گئی۔۔ جب علامہ اقبال کی چھٹیاں ختم ہوئیں تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی لاہور چلے گئے، کئی ایک کام نمٹانے تھے۔ وہاں جا کر وہ تقریباً روز خیریت معلوم کرنے کے لیے خط لکھتے یا کسی اور ذریعے سے والدہ کی خیریت معلوم کرتے۔ ٹیلی فون کی سہولت اتنی عام نہ تھی البتہ تار موجود تھے۔ چنانچہ تار کے ذریعے بھی والدہ کی خیریت دریافت کر لیتے تھے۔

بخار کی شدت بڑھتی گئی اور اکتوبر 1914ء کے وسط تک طبیعت اس قدر خراب ہو گئی اور کمزوری میں اضافہ ہو گیا کہ ہلنا جلنا بھی ممکن نہ رہا۔ ایسی حالت کا علامہ اقبال کو پتا چلا تو وہ پہلی فرصت میں ہی سیال کوٹ پہنچ گئے۔ بے جی کی بگڑتی صحت نے انہیں اس قدر پریشان کر دیا تھا کہ وہ دن رات ماں کے سرہانے بیٹھے رہتے۔ سیال کوٹ میں سینئر ڈاکٹروں اور حکیموں سے جب علامہ اقبال مطمئن نہ ہوئے تو لاہور سے ایک دوست ڈاکٹر کو بلوا لیا مگر والدہ کی طبیعت میں بہتری نہ آئی۔

نومبر کے ابتدائی دنوں میں بے جی کی طبیعت اس قدر بگڑ گئی کہ غذا حلق سے نیچے نہیں اترتی تھی۔ صرف پانی کے چند قطرے ہی ناتواں جسم کو سہارا دے رہے تھے۔ گزشتہ 80 برسوں سے ''اقبال منزل'' کی اس مالکن نے اپنی پیاری اور مہربان کرنوں سے اس گھر پہ اپنا سایہ رکھا جس کے مہرباں سایے تلے ''بالے'' نے اپنا بچپن اور جوانی گزاری۔ وہ مہرباں سایہ آہستہ آہستہ ڈھلتا جا رہا تھا۔ سارا گھرانہ اور محلے کے لوگ اس نیک اور پیاری عادات کی مالک خاتون کی عیادت کے لیے آ رہے تھے جس نے اپنے رویے سے لوگوں کے دلوں کو جیت لیا تھا۔

والدہ سے اقبال کی عقیدت و محبت کا یہ نتیجہ تھا کہ جب انہیں ماں کے انتقال کا معلوم ہوا تو وہ سخت صدمے کی کیفیت میں تھے۔ کئی دن تک دل گرفتہ رہے۔ تعزیت کے لیے آنے والوں کے سامنے والدہ کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے آبدیدہ ہو جاتے۔ علامہ اقبال نے اپنی والدہ کی وفات پر مہاراجہ کشن پرشاد کو خط لکھا۔

''اس حادثے نے میرے دل و دماغ میں شدید تغیر پیدا کر دیا ہے۔ میرے لیے دنیا کے معاملات میں دلچسپی لینا اور دُنیا میں آگے بڑھنے کی خواہش کرنا صرف مرحومہ کے دم قدم سے وابستہ تھا۔ اب تو یہ حالت ہے کہ موت کا انتظار ہے۔''

علامہ اقبال نے بے جی سے اپنی محبت کا اظہار اپنی طویل نظم ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' میں بھی کیا۔

9 نومبر علامہ اقبال کی پیدائش کا دن ہے۔ اس دن ہم ان کے افکار و خیالات اور ان کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہیں، ہر حوالے سے انہیں یاد کرتے ہیں۔ لیکن شاید آپ کو یہ معلوم نہیں کہ 9 نومبر خود علامہ اقبال کے لیے بھی خاص اہمیت رکھتا تھا کیوں کہ اسی تاریخ یعنی 9 نومبر 1914ء کو ان کی والدہ ''بے جی'' کا انتقال ہوا تھا۔ ہمیں چاہیے کہ علامہ اقبال کی اس عظیم ہستی کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس عظیم ماں کو بھی اپنی عقیدتوں و محبتوں کے پھول دُعاؤں کی صورت میں نچھاور کریں جس نے اپنے ''بالی'' کی ایسے انداز میں تعلیم و تربیت کی کہ آج ایک دُنیا اس عظیم ماں کی احسان مند ہے۔

سلسلہ کھوج لگائیے میں حصہ لینے والے بچوں کے نام

محمد حارث آفتاب، لاہور۔ عبداللہ بن نعیم، جہلم۔ شہزادی خدیجہ شفیق، لاہور۔ مہر اکرم، لاہور کینٹ۔ فاطمہ نعیم، اسلام آباد۔ محمد حنظلہ، اٹک۔ عائشہ بی، جہلم۔ فاریہ زاہد، محمد فائق زاہد، لاہور۔ ثمر خان، بھکر۔ عائشہ ذوالفقار، لاہور کینٹ۔ خنصہ سکندر، سرگودھا۔ محمد شبیہ عباس، لاہور۔ عبیرہ مشتاق، کراچی۔ محمد مجید خان، بھکر۔ محمد ریحان عطر، خانیوال۔ ماہ رخ آمنہ، چیچہ وطنی۔ حفصہ اعجاز، صوابی۔ زم زم محسن علی، نوشہرہ۔ فائقہ ہمایوں، لاہور۔ منٰی حماد، لاہور۔ عبداللہ عارف، لاہور۔ محمد احمد ریاض، اوکاڑہ۔ اشمل افضل، لاہور۔ اسد علی انصاری، ملتان۔ رقیہ صدیقی، چکوال۔ عائشہ شہباز، بورے والا۔ ولید اشرف، گوجرہ۔ عکس عائشہ نور، خانیوال۔ مہوش سرور، کراچی۔ راشد جاوید، ملتان۔ محمد زین عظمت، گوجرانوالہ۔ شرافت ضیاء، اسلام آباد۔ محمد طلحہ، راولپنڈی۔ صوبیہ اقبال، کراچی۔ صفا رشید، کراچی۔ فاران شاہد، لاہور۔ محمد زوہیب، کوہاٹ۔ شازیہ فرخ جنجوعہ، جہلم۔ محمد بلال عباس، لاہور۔ عباس خان، میاں والی۔ محمد نعیم امین، لاہور۔ ثمرہ طارق بٹ، گوجرانوالہ۔ مفیسہ رانی، راہوالی۔ وریشا جاوید، سیال کوٹ۔ اریشا ارشد، فیصل آباد۔ مریم سلمان بٹ، گوجرانوالہ۔ احمد عبداللہ، میاں والی۔ اسامہ احمد، گجرات۔ بختاور افضل، لاہور۔ محمد فرحان، واہ کینٹ۔ محمد اسماعیل خان، لاہور۔ حذیفہ انوار، جھنگ۔ محمد صفی خان، پشاور۔ محمد حسان بن رضوان، گوجرانوالہ۔ محمد اسد ارشد، لاہور کینٹ۔ عبدالرحمٰن، لاہور۔ عبدالجبار رومی انصاری، لاہور۔ صبیح الحسن، سیال کوٹ۔ حسن رضا سردار، محمد صفدان رضا قادری، حلیمہ نشان، خدیجہ نشان، کامونکی۔ انیزہ مظفر، لاہور۔ ضحیٰ حبیب، لالہ موسیٰ۔ محمد سعد اللہ، اسلام آباد۔ زین خان، سرگودھا۔ رخشی آفتاب، کراچی۔ سحر فاطمہ، لاہور۔ تحریم مریم شاہد، ملتان۔ میمونہ صدیق، وہاڑی۔ ضحیٰ اشرف، گوجرانوالہ۔ عبدالرحمٰن، چیچہ وطنی۔ محمد احمد، ساہی وال۔ محمد ہاشم اسلم، گوجرانوالہ۔ ذیشان احمد صدیقی، میاں والی۔ حیدر علی رانا، سرگودھا۔ نور حسین قادری، کامونکی۔ عدیل امجد، جہلم۔ صدام حسین قادری، حسنین رضا قادری، محمد سلمان رضا قادری، محمد فریاد علی قادری، نور فاطمہ قادری، محمد حامد رضا قادری، محمد نعمان رضا قادری، کامونکی۔

مزارِ اقبالؒ

شاعرِ مشرق، مصورِ پاکستان، حضرت علامہ محمد اقبالؒ 9 نومبر 1877ء کو سیال کوٹ میں پیدا ہوئے جب کہ 21 اپریل 1938ء کو آپ نے وفات پائی۔ آپ کو لاہور حضوری باغ کے

احاطہ میں دفن کیا گیا۔ بعدازاں ایک کمیٹی بنی جس کے سربراہ چوہدری محمد حسین تھے۔ اس کمیٹی نے مزار اقبالؒ کو تعمیر کرنے کی غرض سے متعدد فیصلے کیے، جس کی روشنی میں حیدر آباد دکن کے ماہرِ تعمیرات نواب زین یار جنگ نے مغلیہ و افغان طرز کی عمارت ایک لاکھ روپے کی لاگت سے 13 برس میں مکمل کی کیوں کہ تعمیراتی پتھر بھارت سے آتا تھا۔ اس لیے آزادی (1947ء) کے بعد یہ کام سست روی کا شکار ہوگیا۔ آج یہ عظیم عمارت بادشاہی مسجد اور شاہی قلعہ کے سامنے موجود ہے۔ اس سادہ اور پُرشکوہ مزار پہ پاکستان رینجرز کا پہرہ ہوتا ہے۔ سرخ رنگ کا پتھر جسے "LAPIS LAZULI" کہا جاتا ہے، اس کی تعمیر میں استعمال ہوا ہے جو افغانستان کی عوام نے تحفتاً دیا تھا۔ عمارت مستطیل شکل کی ہے جس کا ایک دروازہ مشرقی اور دوسرا جنوبی سمت میں ہے۔ مزار پہ سفید ماربل لگا ہے۔ دیواروں پہ اقبالؒ کی کتاب زبورِ عجم سے لیے گئے اشعار کندہ ہیں۔ قرآنی آیات کی کیلی گرافی بھی کی گئی ہے۔ مزار کے باہر سرسبز ٹکڑیوں میں منقسم باغ بھی ہے۔ اس مزار کی تعمیر میں استعمال ہونے والا پتھر اسی نوعیت کا ہے جو مغل شہنشاہ بابر کے مقبرے میں استعمال ہوا ہے۔ ہر سال ہزاروں افراد مزارِ اقبالؒ دیکھنے آتے ہیں۔

سفیدہ

یوکلپٹس (EUCLAYPTUS) درخت کو سفیدہ کہا جاتا ہے۔ اس طویل القامت درخت کا بنیادی تعلق آسٹریلیا سے ہے۔ پھول دار پودوں میں اس کا شمار بلند ترین درختوں میں ہوتا ہے۔ اس کا تعلق "MYRTACEAE" خاندان سے ہے۔ اس کی 700 اقسام معلوم ہو چکی ہیں۔ اس درخت کی سب سے چھوٹی نسل (SPECIES) 10 میٹر (33 فٹ) جب کہ بڑے سے بڑا درخت 60 میٹر سے زائد (200 فٹ سے زائد) اونچا ہوتا ہے۔ یہ سدا بہار درخت ہے۔ اس

کے پتوں میں آئل پیدا کرنے والے غدود پائے جاتے ہیں۔ اس کے پھول سفید، کریمی، گلابی یا سرخ ہوتے ہیں۔ ایک اوسط عمر کا درخت سالانہ 300 کلوگرام کاربن ڈائی آکسائیڈ جذب کرتا ہے۔ دُنیا کا طویل القامت سفیدہ آسٹریلیا میں ہے جس کی اونچائی 99.6 میٹر (327 فٹ) ہے۔ اس کا نام (EUCALYPTUS REGNANS)

ہے۔ اس درخت میں آئل پیدا ہوتا ہے جو جلد آگ پکڑ لیتا ہے۔ اسی لیے اکثر آسٹریلیا کے جنگلات آگ پکڑ لیتے ہیں۔ سفیدہ سے حاصل ہونے والے مادے مثلاً آئل اور "EUCALYPTOL" مصالحہ جات، ہوا والی گولیاں، خوشبو، کریم، کیک، بوتلوں، ماؤتھ واش میں استعمال ہوتا ہے۔ ان سے کھانسی کا شربت، ٹوتھ پیسٹ اور ٹافیاں بھی بنائی جاتی ہیں۔

ہائی جمپ (High Jump) ایک دلچسپ کھیل ہے جس میں کھلاڑی مخصوص فاصلے سے 30 سے 40 ڈگری پہ دوڑ کر سامنے لگی

رکاوٹ (Horizontal Bar) کو عبور کرتا ہے۔ کھلاڑی یہ جمپ بغیر کسی شے کی مدد کے لگاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے مخصوص جوتے استعمال ہوتے ہیں جنہیں "SPRINT SPIKES" کہا جاتا ہے۔ جوتے میں 11 سے زائد SPIKES کی اجازت نہیں ہوتی۔ سات SPKIES اگلے حصے میں جب کہ چار SPKIES جوتے کی ایڑھی میں ہوتے ہیں۔ یہ جوتے وزن میں ہلکے ہوتے ہیں تاکہ کھلاڑی کو کودنے میں مشکل نہ ہو۔ ان SPKIES کی لمبائی 12 ملی میٹر تک ہوتی ہے۔ کیوبا کے کھلاڑی "JAVIER SOTOMYOR" نے 1993ء سے 2.45 میٹر (8 فٹ 1-1/4) انچ چھلانگ لگا کر ورلڈ ریکارڈ قائم کر رکھا ہے۔ جب کہ خواتین میں بلغاریہ کی "STEFAKA KOSTADIVONA" نے 2.09 میٹر (6 فٹ 10 انچ) ہائی جمپ لگا کر ورلڈ ریکارڈ بنا رکھا ہے۔ اولمپکس اور پاکستان کے قومی اتھلیٹکس میں بھی ہائی جمپ کا کھیل شامل ہے۔

گندھک کا تیزاب

کیمیا کی دُنیا میں گندھک کا تیزاب یا ترشئہ گندھک کو ”کنگ آف کیمیکلز“ کہا جاتا ہے۔ کسی ملک کی صنعتی ترقی کو ماپنے کا ذریعہ یہ ہے کہ اس ملک میں کتنا گندھک کا تیزاب بنتا اور استعمال ہوتا ہے۔ اس کا تاریخی نام "OIL OF VITRIOL" ہے کیوں کہ یہ لوہے اور سلفر کو جلا کر حاصل ہوتا ہے۔ یہ بہت تیز تیزاب ہے جو جلد کو جلا دیتا ہے اور میٹلز (Metals) اور پتھر (Stones) کو گھس

دیتا ہے، یعنی یہ CORROSIVE ہے۔ مسلم سائنس دان جابر بن حیان نے گندھک کے تیزاب (سلفیورک ایسڈ) کی تیاری متعارف کروائی۔ اس کا کیمیائی فارمولہ H_2SO_4 ہے جب کہ اس کی کثافت (Denisty) $1.84 g/cm^3$ اور نقطۂ کھولاؤ $337C^o$ ہے۔ وینس سیارے کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس کی فضا میں سلفیورک ایسڈ کے بخارات شامل ہیں۔ اس تیزاب کی تیاری کا مقبول طریقہ "CONTACT PROCESS" کہلاتا ہے۔ دُنیا بھر میں سالانہ 180 ملین ٹن سے زائد سلفیورک ایسڈ پیدا ہوتا ہے۔ یہ تیزاب کھادوں، ڈیٹرجنٹس، واٹر ٹریٹمنٹ، کاغذ سازی، Resin، رنگ سازی، ادویات، کپڑا سازی، Lubricants، بیٹریوں، بیٹری سیلز (Cells)، ڈائیز (Dyes) اور نائیلون کی تیاری میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ خطرناک تیزاب ہے اس کو احتیاط سے لیبارٹری میں استعمال کرنا چاہیے۔

انمول باتیں

☆ انسان موت سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور جہنم سے نہیں، حالاں کہ کوشش کرنے سے انسان جہنم سے بچ سکتا ہے، موت سے نہیں۔

☆ اپنے خیالات کو شیشے کی طرح صاف رکھو کیوں کہ خیالات سے ہی الفاظ بنتے ہیں، الفاظ سے عمل بنتا ہے، عمل سے کردار بنتا ہے اور کردار سے بھی انسان اچھا یا بُرا لگتا ہے۔

☆ دوست وہ نہیں ہوتا جو تمہاری تعریف کرے بلکہ دوست وہ ہوتا ہے جو تمہاری اچھائیوں کے ساتھ ساتھ برائیوں سے بھی آگاہ کرے۔

☆ کسی کو بُرا مت کہو، کیا پتا وہ اللہ کی نظر میں تم سے زیادہ اچھا ہو۔

☆ ہر کام خوب محنت سے کرو اور نتیجہ اللہ پر چھوڑو۔

(اشمل افضل، لاہور)

اقوالِ زریں

☆ دوسروں کی بدقسمتی سے احتیاط کا درس لو۔

☆ سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ تم کسی کے ایسے عیب کا تذکرہ کرو جو تم میں بھی موجود ہو۔

☆ آزادی کی کوئی قیمت نہیں۔

☆ تحریر ایک خاموش آواز ہے اور قلم ہاتھ کی زبان ہے۔

☆ جن لوگوں کے خیالات اچھے ہوتے ہیں وہ کبھی تنہا نہیں ہوتے۔

(حافظ محمد حسن، گوجرانوالہ)

سنہری باتیں

☆ اگر کسی بات کا جواب معلوم نہ ہو تو لاعلمی کا اظہار کرنا نصف علم ہے۔

☆ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔

☆ اسلام میں حکومت کرنے کا حق صرف اسی کو حاصل ہے، جس کے ہاتھ میں تلوار پکڑنے کی ہمت ہو۔

☆ بہترین انسان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔

☆ انسان ہمیشہ سے کامیاب ہے مگر اپنے بُرے افعال سے خود کو ناکام بنا دیتا ہے۔

☆ مخلوقِ خدا سے صلۂ رحمی کرنا بہترین عمل ہے۔

☆ اصل قابلِ تعریف وہ شخص ہے جس کی تعریف ہمسائے اور دوست کریں۔

☆ آزادی ہزار نعمت ہے مگر اس کی قدر آزاد کو نہیں۔ صرف وہ لوگ اس کی قدر جانتے ہیں جو آزادی سے محروم ہیں۔

☆ ایسے ستاروں کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے جو رات کی تاریکی میں بھٹکے ہوئے قافلوں کو ان کی منزل تک پہنچاتے ہیں اور آفتاب کے نمودار ہوتے ہی اپنا آپ چھپا لیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو قوم کی تقدیریں بدلتے ہیں۔

☆ نہ گرنا کمال نہیں، بلکہ گرنے کے بعد نئے سرے سے کھڑا ہونا کمال ہے۔

(عاکف شہزاد، جہلم)

روشن کرنیں

☆ حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرو تاکہ تدبیر سے تقدیر مسکرا اٹھے۔

☆ حسد کرنے والے کے لیے یہی سزا کافی ہے کہ جب آپ خوش ہوتے ہیں تو وہ اداس ہو جاتا ہے۔

☆ محنت اور ہنرمندی کے آگے کچھ بھی ناممکن نہیں۔

☆ عادت کی اگر مزاحمت نہ کی جائے تو یہ جلد ہی ضرورت بن جاتی ہے۔

☆ عظیم خیالات پر جب عمل کیا جائے تو وہ عظیم کارنامے بن جاتے ہیں۔

☆ ماہر وہ ہوتا ہے جو چھوٹی غلطیاں نہیں کرتا بلکہ بڑی غلطی کرتا ہے۔

(محمد آویز ساجد، ڈیرہ غازی خان)

استغفار کی فضیلت

حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ رسولؐ نے فرمایا۔
جب شیطان مردود ہو گیا تو اس نے کہا کہ ''اے رب! تیرے عزت و جلال کی قسم میں تیرے بندوں کو تب تک بہکاتا رہوں گا جب تک ان کے جسموں میں روح موجود رہے گی۔
اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا کہ:
''مجھے اپنے عزت و جلال کی قسم اور اپنے اعلیٰ مقام کی کہ جب تک وہ مجھ سے استغفار کرتے رہیں گے، میں انہیں بخشتا رہوں گا۔''

(امیمہ بابر، سیال کوٹ)

ماں کی دُعا

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک دفعہ اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ جنت میں میرے ساتھ کون ہوگا؟
ارشاد ہوا، فلاں قصاب ہوگا۔
آپؑ کچھ حیران ہوئے اور اس قصاب کی تلاش میں چل پڑے۔ وہاں دیکھا تو ایک قصاب اپنی دکان پر گوشت فروخت کرنے میں مصروف تھا۔ اپنا کاروبار ختم کر کے اس نے گوشت کا ایک ٹکڑا کپڑے میں لپیٹا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس قصائی کے گھر کے بارے میں مزید معلومات جاننے کے لیے بطور مہمان گھر چلنے کی اجازت چاہی۔
گھر پہنچ کر قصائی نے گوشت پکایا، پھر روٹی پکا کر اس کے ٹکڑے شوربے میں نرم کیے اور دوسرے کمرے میں چلا گیا جہاں نہایت کمزور بڑھیا پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ قصاب نے بمشکل اسے سہارا دے کر اٹھایا اور ایک ایک لقمہ اس کے منہ میں دیتا رہا۔ جب اس نے کھانا تمام کیا تو بڑھیا کا منہ صاف کیا۔ بڑھیا نے قصاب کے کان میں کچھ کہا جسے سن کر قصائی مسکرایا اور بڑھیا کو لٹا کر واپس باہر آ گیا۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا، بڑھیا نے کیا کہا؟
تو قصاب نے کہا۔
''یہ میری ماں ہے اور روز یہ دُعا دیتی ہے کہ جنت میں تمہیں (یعنی مجھے) حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ نصیب ہو۔''

(محمد احمد خان غوری، بہاول پور)

رازق و مالک

حضرت ابراہیمؑ مہمان کے بغیر کھانا نہ کھاتے۔ ایک مرتبہ تین روز تک کوئی مہمان نہ آیا۔ پھر ایک بوڑھے آتش پرست کا ان کے دروازے سے گزر ہوا۔ انہوں نے بوڑھے سے پوچھا:
تو کون ہے؟
اس نے کہا: میں آتش پرست ہوں۔
ابراہیمؑ نے کہا: تو میرا مہمان بننے کے لائق نہیں۔
اللہ تعالیٰ کو یہ بات ناگوار گزری اور ارشادِ الٰہی نازل ہوا:
اے ابراہیمؑ! میں تو ستر برس سے اس کی پرورش کر رہا ہوں اور تجھ سے اتنا نہ ہوا کہ ایک وقت کی روٹی کا ٹکڑا اسے دے دیتا۔

(فضیلہ نیاز، واہ کینٹ)

قلم کہانی

قلم وہ چیز ہے جسے آج کل قلم نہیں پین کہتے ہیں۔ قلم وہ ہے جس نے آدمی کو انسان بنایا، جس نے ہمیں علم دیا اور جہالت کے سمندر سے نکالا۔ ہزاروں سال پہلے جب قلم ایجاد ہوا تو آدمی نے لکھنا سیکھا۔ آپ ﷺ پر جب وحی نازل ہوئی تو اس کے الفاظ یہ تھے۔ ''پڑھ اپنے رب کے نام سے ہے جس نے تجھے پیدا کیا۔ جس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا۔ پڑھ تمہارا پروردگار بہت کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا۔ انسان کو وہ باتیں سکھائیں جس کا اسے علم نہیں تھا۔'' پہلے لوگ نوکیلے پتھروں کو قلم کی جگہ استعمال کرتے تھے، پھر ایک مصری باشندے نے بانس کے ڈنڈے کو کاٹا، اس کی نوک بنائی اور پھر اسے سیاہی میں ڈبویا اور پھر ایک الگ چمڑے کے اوپر لکھنا شروع ہو گیا اور یوں ایک قلم ایجاد ہوا۔ اس کے بعد کچھ لوگوں نے پرندوں کے (بیشتر بطخ کے) پروں کی نوک کو چھری سے تیز کر کے اس سے لکھنا شروع کر دیا۔ 953ء میں ایک مسلمان محمد معزالدین نے پہلا فاؤنٹین قلم بنایا۔ اس قلم میں سیاہی آہستہ آہستہ نب کی جانب آتی ہے۔ آج کل اسی قلم کی ترقی یافتہ شکل مارکر، بال پوائنٹ، ہائی لائٹر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قلم کو اتنی عزت بخشی ہے کہ قرآن پاک میں قلم نام کی سورۃ بھی آئی ہے۔

(صفا رشید، کراچی)

بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی

زبیدہ سلطانہ

رات سوتے میں اچانک ارشد میاں کی آنکھ کھل گئی۔ شاید کوئی آہٹ ہوئی تھی۔ سوچا اور کسمسا کر کروٹ بدل لی۔ ابھی آنکھ لگنے نہ پائی تھی کہ پھر کھٹکا ہوا اور چونک پڑے۔ کان لگا کر سنا تو باورچی خانے میں کچھ کھٹ پٹ ہو رہی تھی۔

''افوہ! کیا مصیبت ہے! کل ہی ان بدبخت چوہوں کا کچھ بندوبست کرتا ہوں۔''

ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ کھٹاک سے کوئی بڑا برتن گرا اور یہ اُچھل کر اُٹھ بیٹھے۔ بیگم بھی جاگ اُٹھی تھی۔

''چوہے آخر پرات تو گرا نہیں سکتے!'' بیگم سہم گئی۔

ارشد میاں دبے پاؤں باورچی خانے کی طرف چلے۔ اندر بالکل اندھیرا تھا مگر وہ کمرے سے نکلتے ہی ہلکی سی روشنی کا ہالہ باورچی خانے کی دیوار پر دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے برآمدے کی بتی جلائی اور پکار کر کہا۔ ''خبردار! اپنی جگہ سے حرکت نہ کرنا۔''

مگر چور بھلا ان کا حکم مانتا۔ یہ دروازے سے داخل ہوئے، وہ کھڑکی سے صحن میں کود گیا اور بڑا سا تھیلا ہاتھ میں لیے دیوار کی طرف دوڑا۔ ارشد میاں بڑی دلیری سے اس کے پیچھے دوڑے۔ چور چھریرے بدن کا تھا اور میاں تھے بھاری بھرکم۔ چور نے بجلی کی سی تیزی سے پہلے تھیلا دیوار کے اس پار پھینکا، پھر ایک زقند لگائی اور پل بھر میں دوسری طرف پھلانگنے لگا۔ ارشد میاں پہنچے تو سہی اور چور کی پشت سے لنگوٹی میں بھی ہاتھ ڈال دیا، مگر چور زیادہ طاقت ور ثابت ہوا۔ خود تو نکل گیا مگر لنگوٹی ارشد میاں کے ہاتھ میں رہ گئی، جسے ہاتھ میں جھلاتے اور ہانپتے ہوئے واپس آئے۔ سب گھر والے برآمدے میں منتظر کھڑے تھے۔ بیگم نے پوچھا۔

''ارے! یہ کیا ہے؟''

ارشد میاں کھسیانے ہو کر بولے۔ ''یہ...... یہ لنگوٹی!'' سب بچوں نے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے ہانک لگائی:

''چلو جی! چور نہ سہی چور کی لنگوٹی ہی سہی!''

بیگم منہ بسور کر بولیں۔ ''وہ سارا باورچی خانہ سمیٹ کر تمہارے سامنے نکل گیا اور تم اس کی لنگوٹی لیے بڑے ہشاش بشاش چلے آ رہے ہو؟'' جب زیادہ نقصان اٹھا کر تھوڑے پر اکتفا کر لیا جائے تو کہنے والے کہتے ہیں کہ بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی!

تیس روپے والی مچھلی

روبنسن سیموئیل گل

اسکول میں چھٹی ہوئی تو آئس کریم، چھلی، گول گپے اور قلفی والے ٹھیلوں پر اسکول کے بچوں کا ہجوم لگ گیا۔ مچھلی والا بھی اپنی سائیکل پر رنگ برنگی مچھلیاں پلاسٹک کے لفافوں میں سجائے اپنے کام میں مصروف تھا۔ ثاقب نے ایک عدد قلفی خریدی اور پھر مچھلیوں والے کے پاس آ گیا۔ ''بھائی یہ والی مچھلی کتنے کی ہے؟''

اسے جو مچھلی پسند آئی اس کی قیمت دکان دار نے تیس روپے بتائی۔ اپنی پاکٹ منی سے اس نے وہ مچھلی فوراً خرید لی۔

مچھلی والے نے کہا۔ ''بیٹا اس کو گھر تک لفافے میں لے جانا، اس میں مَیں نے سوراخ کر دیا ہے۔ دھیان رکھنا یہ سوراخ کہیں بند نہ ہو جائے ورنہ مچھلی مر جائے گی...... اور ہاں جاتے ہی کسی برتن میں پانی بھر کر چھوڑ دینا ورنہ اس لفافے میں مچھلی شام تک مر جائے گی۔''

مچھلی کے ہمراہ اس نے بیس روپے کا پیکٹ بھی دیا جس میں بے شمار دانے تھے۔ ''روزانہ ایک مرتبہ چار یا پانچ دانے مچھلی کو کھلانے ہیں، اس سے زیادہ نہیں ورنہ......''

''اچھا اچھا ٹھیک ہے، میں ایسا ہی کروں گا۔'' اس بار ثاقب نے مچھلی والے کو جملہ مکمل نہیں کرنے دیا کیوں کہ وہ ہر نصیحت کے بعد یہی کہتا تھا، ''ورنہ مچھلی مر جائے گی'' اور ثاقب اپنی اس ننھی منی سی تیس روپے والی مچھلی کے متعلق یہ ہرگز نہیں سننا چاہتا تھا۔ اس نے تو بڑے شوق سے یہ مچھلی خریدی تھی۔ اسی دوران اس کا بڑا بھائی عاقب بھی وہاں پہنچ گیا۔ وہ بھی نارنجی رنگ کی خوب صورت مچھلی دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ دکان دار کو پچاس روپے ادا کرنے کے بعد دونوں خوشی خوشی گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ وہ دونوں پُرمسرت تھے کہ انہیں ایک عدد پالتو جانور مل گیا۔

''مچھلی کو دیکھ کر ماما بھی خوش ہوں گی۔'' ثاقب نے کہا۔

''ہاں! بالکل یہ مچھلی انہیں بہت پسند آئے گی۔''

ایسا ہی ہوا۔ ان کی والدہ نے جب پولی تھین بیگ میں خوب صورت مچھلی کو حرکت کرتے دیکھا تو محظوظ ہوئیں اور فوراً بولیں۔ ''جلدی جلدی اس کو کہیں رکھنے کا بندوبست کرو ورنہ بے چاری مر جائے گی۔''

''اوہو ماما، آپ ایسی باتیں کیوں کرتی ہیں، یہ نہیں مرتی...... ہم اس کو مرنے تھوڑی دیں گے۔'' ثاقب نے مسکراتے ہوئے اپنی والدہ کو بھی ٹوک دیا۔ عاقب نے اپنے پلان سے ثاقب اور والدہ کو آگاہ کیا۔ ''ماما جان! ہم شام کو ہی جا کر اس کے لیے ایک اچھا سا ایکویریم (Aquarium) خرید لیتے ہیں۔'' ثاقب قدرے پُرتشویش انداز میں بولا۔ ''شام تو ابھی بہت دُور ہے تب تک تو یہ بے چاری واقعی مر جائے گی۔ آخر اس وقت تک کیا کیا جائے؟''

امی جان نے کچن سے ایک گہرا ڈونگا لا کر دیا اور بولیں۔ ''فی الحال تو اس میں رکھ لو۔ شام تک اچھا سا ایکویریم لے آنا مگر ماموں کو ضرور ساتھ لے جانا۔'' مچھلی کو جونہی ڈونگے میں ڈالا گیا وہ خوشی

کے عالم میں پورے ڈونگے میں چکر لگانے لگی۔ ثاقب نے کھانے کے دو دانے ڈونگے میں ڈالے تو مچھلی نے فوراً انہیں نگل لیا۔ تینوں مچھلی کا یہ تماشا دیکھ کر بے حد محظوظ ہوئے۔

امی کہنے لگیں۔ ''شام کو اپنے ماموں جان کو بھی ضرور ساتھ لے کر جانا، میں انہیں فون کر دوں گی۔ اے ٹی ایم کارڈ لے جانا اور پیسے نکلوا کر ایکوریم خرید لینا۔'' ان کے والد سعودی عرب میں کسی آئل کمپنی میں اچھے عہدے پر فائز تھے۔ خود تو سال میں ایک دو بار چکر لگاتے تھے مگر پیسہ خوب گردش میں رہتا تھا اور عاقب، ثاقب اور ان کی والدہ بے دریغ پیسہ خرچ کرتے تھے۔ فضول خرچی تو ان کے معمول کا حصہ تھی۔

شام کے انتظار میں عاقب اور ثاقب کے لیے ہوم ورک کرنا بھی انتہائی دشوار ہو رہا تھا۔ دونوں نے عجلت میں دوپہر کا کھانا کھایا اور بار بار مچھلی کو دیکھا کہ کہیں مر نہ گئی ہو۔ آخر شام سے پیشتر ہی دونوں بازار جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

''اوہو، میں نے تمہارے ماموں کو فون کیا ہے وہ شام کو آ جائیں گے، اگر نہ بھی آ سکے تو کل لے لینا، مچھلی کو کچھ نہیں ہوتا۔''

مگر عاقب اور ثاقب نے ایک نہ مانی۔ ''آپ فکر نہ کریں ہم اقبال روڈ والی مارکیٹ سے اچھا سا ایکوریم خود ہی خرید لیں گے۔ پتا نہیں، ماموں جان کو کل بھی وقت ملتا ہے یا نہیں...... تب تک کیا مچھلی بے چاری ڈونگے میں ہی رہے گی؟''

خیر وہ والدہ کے سمجھانے کے باوجود نہ مانے۔ اے ٹی ایم کارڈ کا استعمال تو ان کے لیے معمولی کام تھا۔ اکثر والدہ انہیں پیسے نکلوانے کے لیے بھیج دیتیں۔ چنانچہ اب بھی وہ چار و ناچار مان ہی گئیں۔ البتہ یہ طے نہ ہوا کہ کتنی قیمت کا ایکوریم خریدا جائے۔

عاقب اور ثاقب اے ٹی ایم کارڈ لیے ہوئے سہ پہر میں ہی اس مارکیٹ کی جانب روانہ ہو گئے جہاں سے پرندے اور مچھلیاں وغیرہ ملتی تھیں۔ اس مارکیٹ میں کبوتر، چوزے، آسٹریلین طوطے، مصری مرغی، بطخ، تیتر، سبز طوطوں کے علاوہ ہر قسم کی مچھلیاں اور ان کے ایکوریم ملتے تھے۔ عاقب اور ثاقب مچھلیوں کی ایک دکان میں داخل ہوئے۔ آتے ہوئے انہوں نے ایک اے ٹی ایم مشین بھی دیکھ لی تا کہ ریٹ معلوم کرنے کے بعد پیسے نکلوا سکیں۔

''جتنے کا ایکوریم آئے گا ہم اتنے ہی پیسے نکلوا لیں گے۔''

''ہاں، ایسے ٹھیک رہے گا۔'' عاقب کی بات سن کر ثاقب نے بھی اتفاق کیا۔

دکان میں خوب صورت اور رنگ برنگی مچھلیاں بڑے بڑے ایکوریمز میں تیرتی ہوئی بہت بھلی اور خوب صورت دکھائی دے رہی تھیں۔ ''انکل! ہمیں ایک عدد ایکوریم چاہیے۔''

دکان دار نے دیکھا کہ بچے قدرے چھوٹے ہیں مگر ہوشیار بننے کی کوشش کر رہے ہیں تو اس نے انہیں اُلو بنانے کا ارادہ کر لیا۔

''آپ آئیں تشریف رکھیں جیسا ایکوریم آپ کہیں گے ویسا بنا دیں گے۔'' دونوں نو عمر بچے اپنے آپ کو بڑا ظاہر کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ ''آپ کو کیسا ایکوریم چاہیے؟''

''بس اچھا اور خوب صورت سا ہو، جس میں ہماری مچھلی خوش رہے اور زندہ بھی رہ سکے۔'' ثاقب کی بات سن کر دکان دار مسکراتے ہوئے بولا۔ ''پھر تو آپ کو اچھا والا ایکوریم بنا کر دیں گے، جس میں مچھلی خوش حال زندگی گزار سکے۔'' دونوں بھائیوں نے ڈھیر ساری مچھلیوں میں سے ایک نارنجی رنگ والی مچھلی تلاش کر لی جو ہو بہو ان کی پالتو مچھلی جیسی تھی۔

''اوہ! یہ بالکل ہماری مچھلی جیسی ہے۔'' عاقب نے اپنے چھوٹے بھائی کو مخاطب کر کے کہا اور پھر دکان دار سے پوچھا۔

''بھائی! یہ والی مچھلی کتنے کی ہے؟''

''کون سی، یہ جو نارنجی رنگ والی ہے؟''

''جی جی، بالکل یہی والی۔''

''صرف بیس روپے کی۔''

دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا انہیں تو تیس روپے کی مچھلی ملی تھی اور یہاں صرف بیس روپے کی تھی۔ انہیں یہ تسلی بھی ہو گئی کہ اس دکان کے ریٹس انتہائی مناسب ہیں۔ ثاقب کے قریب سرگوشی کرتے ہوئے عاقب بولا۔ ''تم زیادہ ہوشیار بنتے ہو، اس مچھلی والے نے تمہیں دھوکہ دے دیا۔'' ثاقب قدرے کھسیانا ہو گیا۔ دکان دار نے کم ریٹ بتا کر اپنی دیانت داری اور ایمان داری کی دھاک دونوں بھائیوں پر بٹھا دی تھی ورنہ یہ مچھلی وہ کسی صورت پچاس سے کم نہیں دیتا تھا۔ آخر ایکوریم بنوانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایک اچھے خاصے سائز والا ایکوریم دونوں بھائیوں کو پسند آ گیا۔

''یہ اچھا رہے گا، مچھلی ذرا آزادی کے ساتھ گھوم پھر سکے گی۔ اسے یہ ہی لگے گا کہ وہ دریا یا جھیل وغیرہ میں ہے، بہت خوش ہو گی۔'' ثاقب کی بات سن کر دکان دار بولا۔ ''بالکل درست کہا آپ نے...... اس طرح آپ کی مچھلی تیزی سے بڑی ہو جائے گی اور بہت خوش بھی رہے گی۔'' چنانچہ اسی ایکویریم کا چناؤ کر لیا گیا۔

''آپ کو اس میں آکسیجن پمپ لگوانا پڑے گا ورنہ مچھلی سانس کیسے لے گی؟'' دونوں بھائی فکر مند ہو گئے اور یک زبان ہو کر بولے۔ ''جی جی، آپ لگائیں آکسیجن پمپ، جو جو چیزیں ضروری ہیں وہ لگائیں۔'' آکسیجن پمپ فٹ کرنے کے بعد دکان دار نے ایک اور خدشے کا اظہار کیا۔ ایکویریم میں صفائی کا انتظام ہونا بھی ضروری ہے۔ اگر آپ ایک اور پمپ لگاتے ہیں تو یہ خود بخود پانی کو صاف کرتا رہے گا۔ گندگی کے باعث مچھلی کے جلدی مر جانے کا امکان ہوتا ہے اور آپ کو اس طرح روزانہ پانی بھی نہیں بدلنا پڑے گا۔'' چنانچہ عاقب اور ثاقب کی رضامندی سے یہ لوازمات ایکویریم میں فٹ کر دیے گئے۔ وہ سارے کام کو بڑے انہماک اور دل چسپی کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ اچانک ثاقب کو ایک اور فکر نے آن گھیرا۔

''بھائی! اگر ان میں سے ایک پمپ خراب ہو گیا تو پھر کیا ہو گا؟'' دکان دار ان دونوں کی آپس کی گفتگو کو بغور سنتا تھا اور پھر اس کے مطابق انہیں الو بناتا تھا۔ بھلا گھر آئے رزق کو کون لات مارتا ہے۔ ثاقب کی بات سن کر وہ فوراً بولا۔ ''آپ فکر نہ کریں، میں ڈبل پمپ لگا دیتا ہوں۔ بالفرض ایک خراب بھی ہو گیا تو دوسرے سے کام چلتا رہے گا۔ دونوں بھائی خوش ہوئے کہ ان کی ''تیس روپے والی مچھلی'' اب خوش باش رہے گی اور خوب لمبی عمر پائے گی اور شاید دریا یا جھیل کی مچھلی کی مانند خوب بڑی بھی ہو جائے گی۔ دکان دار انتہائی تسلی سے ایکویریم میں تمام اشیاء نصب کرنے میں مصروف تھا۔ اس کے اندر روشنی کا بھی خاطر خواہ انتظام ہو چکا تھا تاکہ رات کو منظر خوب صورت لگے۔ عاقب اور ثاقب نے اب تک قیمت بھی نہ پوچھی تھی کیوں کہ جیب میں اے ٹی ایم کارڈ تھا، اس لیے انہیں تسلی تھی۔

''کارڈ سے کتنے پیسے نکلوائے جا سکتے ہیں؟'' ثاقب نے پوچھا۔

''میرے خیال سے بیس، پچیس ہزار......''

''اور تمہیں پن کوڈ تو یاد ہے ناں؟''

''ہاں ہاں، بالکل یاد ہے، بھلا وہ بھی کوئی بھولنے والی چیز ہے۔'' اور پھر عاقب قدرے سینہ چوڑا کرتے ہوئے بولا۔ ''امی خواہ مخواہ ہر جگہ ماموں جان کو ہمارے ساتھ نتھی کر دیتی ہیں، بھلا ہم بچے تھوڑی ہیں۔''

اسی وقت دکان دار سمجھ گیا کہ یہ امیر والدین کی شاہ خرچ اولاد ہے، چنانچہ ان سے جتنی بھی کمائی کر لی جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ اس نے ایک اور سوال پوچھا۔ ''آپ ایکویریم کے اندر کون کون سی ڈیکوریشن لگوانا چاہیں گے اور ہاں ان خوب صورت سمندری دنیا کے مناظر میں سے کوئی ایک تصویر بھی منتخب کر لیں۔''

دونوں بھائی تصور کی آنکھ سے اپنے ڈرائنگ روم میں شان دار ایکویریم کو پڑا ہوا دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ ہر آنے والا مہمان کس انداز میں تعریف کیا کرے گا اور جب انہیں یہ بتایا کریں گے کہ ہم دونوں نے خود جا کر بنوایا تھا تو وہ کتنے حیران ہوا کریں گے۔ ثاقب اور عاقب کے سامنے اب بے شمار ڈیکوریشن کی اشیاء بکھری پڑی تھیں۔ سمندری پودے، ایک عدد پلاسٹک کا ڈائیور (Diver) یعنی غوطہ خور جو سمندری منظر کو اور حقیقی بنا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ رنگ برنگے سمندری پھول......

''آپ یہ سب ایکویریم میں فٹ کر دیں۔'' دکان دار کے لیے اس سے زیادہ خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی تھی۔ اس نے فوراً اس سامان کو نفاست کے ساتھ مقررہ جگہوں پر فکس کرنا شروع کیا اور بڑے پُرخلوص انداز میں ایکویریم کی تہہ میں کنکر بکھیرتے ہوئے بولا۔ ''یہ آپ لوگوں کے لیے میری طرف سے خاص تحفہ ہے، ویسے تو یہ پتھر بھی بہت قیمتی ہیں جو پانی میں خراب نہیں ہوتے اور نہ ہی ان پر کائی جمتی ہے۔'' دونوں بھائی دکان دار کے خلوص و ملنساری سے بہت متاثر ہوئے۔ اسی اثناء میں ایک نوعمر لڑکے نے ان دونوں کے سامنے دو عدد پیپسی کی بوتلیں رکھ دیں۔ اب تو دکان دار کی مہمان نوازی نے بھی انہیں بُری طرح متاثر کیا۔ ''آپ نے خواہ مخواہ تکلف کر دیا۔''

''نہیں نہیں، تکلف کی کیا بات ہے؟ آپ جیسے سمجھ دار گاہکوں کی تو ہم قدر کرتے ہیں ورنہ تو لوگوں کو سمجھا سمجھا کر تھک جاتے ہیں پھر بھی وہ اپنی من مانی کرتے ہیں۔ نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ مہنگی

مہنگی مچھلیاں چند دنوں میں مر جاتی ہیں۔“

دکان دار کی باتوں نے تو دونوں بھائیوں کے اعتماد کو بلند ترین سطح تک پہنچا دیا۔ ان ہی چکنی چپڑی باتوں کے دوران آخر کار ایکوریم تیار ہو گیا۔

”لیں جناب! آپ کا ایکوریم تیار ہے۔ اگر کوئی کمی رہ گئی ہو تو بتائیں۔ ویسے میرا مشورہ یہ ہے کہ اس قدر خوب صورت اور شان دار ایکوریم میں مچھلیاں بھی شان دار ہونی چاہئیں۔ اتنے بڑے ایکوریم میں اکیلی مچھلی تو ویسے ہی تنہائی سے فوت ہو جائے گی۔“ دکان دار نے مسکراتے ہوئے یہ بات کہی مگر دونوں بھائیوں کے رونگٹے ایک بار کھڑے ہو گئے۔ وہ کسی بھی قیمت پر اپنی ”تیس روپے والی مچھلی“ کو کھونا نہیں چاہتے تھے۔ آخر اتنا زیادہ اہتمام اسی ایک مچھلی کے لیے تو کیا جا رہا تھا اور اگر وہ مر گئی تو کیا فائدہ؟ چنانچہ چند لمحوں کے لیے دونوں سوچ میں پڑ گئے۔

”تسلی سے سوچ لیں، کوئی مسئلہ نہیں۔ میں آپ کو اعلیٰ نسل کی خوب صورت مچھلیاں انتہائی مناسب قیمت پر دوں گا...... ویسے آپ دونوں کرتے کیا ہیں؟“

دوکاندار نے چالاکی کے ساتھ اگلا سوال پوچھا تاکہ دونوں کو سوچنے کا کم موقع ملے اور وہ جلدی میں فیصلہ کریں جو دکان دار چاہتا تھا۔

عاقب نے فوراً جواب دیا۔ ”ہم دونوں پڑھتے ہیں۔“

”ماشاء اللہ...... کون کون سی کلاس میں؟“

”میں 9th میں پڑھتا ہوں۔“

فوراً ہی ثاقب بولا۔ ”اور میں 8th میں پڑھتا ہوں۔“

”ماشاء اللہ بہت اچھی بات ہے۔“

”پھر کون سی مچھلی پسند کی آپ نے؟“

عاقب اور ثاقب بڑے ایکوریم میں تیرتی ہوئی رنگا رنگ مچھلیوں کو بغور دیکھ رہے تھے۔

”آپ کے والدین آپ کے ساتھ نہیں آئے؟“

دکان دار نے سوالیہ انداز میں پوچھا کیوں کہ وہ قدرے فکر مند ہو رہا تھا کہ کہیں بچوں کا ذہن نہ تبدیل ہو جائے یا ان کے والدین ان کی تلاش میں یہاں نہ آ پہنچیں۔

”ہمارے پاپا سعودی عرب میں ایک آئل کمپنی میں کام کرتے ہیں۔“ ”ماشاء اللہ...... ماشاء اللہ!“

دکان دار کو یہ سن کر تسلی ہوئی، اسی گھڑی موبائل کی گھنٹی بجی۔ عاقب نے فون ریسیو کیا۔

”جی ماما جان، ہم بس آ رہے ہیں...... بہت خوب صورت ایکوریم لے لیا ہے ہم نے، آپ دیکھیں گی تو خوش ہو جائیں گی۔“ دکان دار نے یہ سن کر سکھ کا سانس لیا ورنہ اسے یہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ یہ دو شکار کہیں ہاتھ سے نکل نہ جائیں۔ فون بند کیا تو عاقب اور ثاقب نے متفقہ طور پر تین چار قدرے بڑی مچھلیاں پسند کر لیں۔ ایک ہلکے نیلے رنگ کی تھی، ایک سلور، ایک نارنجی اور چوتھی سنہرے رنگ کی تھی۔ آخر کار وہ مچھلیاں نکال کر ایک شیشے کے مرتبان میں الگ کر لی گئیں۔ اب ادائیگی کا وقت آ پہنچا۔

”جی کتنے پیسے ہو گئے؟“ دکان دار نے ثاقب کی بات سنی اور اداکاری کے انداز میں کیلکولیٹر نکال کر حساب کتاب کرنے لگا۔

”شیشے کا بکس، چار عدد پمپ، ڈیکوریشن کا سامان، چار عدد مچھلیاں اور مزدوری...... کل ملا کر اکیس ہزار روپیہ بن گیا۔“ دونوں بھائیوں کی آنکھیں یکدم حیرانی سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ دکان دار بھی اس صورت حال کو بھانپ گیا اور بولا۔ ”مگر آپ سے گاہکوں والا ریٹ تھوڑی لینا ہے؟“ چنانچہ ایک بار پھر حساب کتاب کیا جانے لگا اور چند لمحوں کے بعد دکان دار بولا۔ ”آپ بس بیس ہزار روپے دے دیں۔ یہ فائنل ہے۔ یقین کریں اس قدر خوب صورت ایکوریم اور قیمتی مچھلیوں کے ہم تیس ہزار سے ایک پیسہ کم نہیں لیتے۔ آپ تو خاصے سمجھ دار گاہک ہیں۔“ عاقب نے جیب پر ہاتھ پھیرا جس میں کریڈٹ کارڈ موجود تھا۔ ”چلیں، ہم پیسے لے کر ابھی آئے۔“ دکان دار بھی بڑا ہوشیار آدمی تھا۔ اس نے فوراً اپنے ملازم کو آواز دی۔ ”جنید، ذرا یہ بھائی کے ساتھ بینک تک تو جانا......!“

وہ بھی دوڑتا ہوا آ گیا۔ ”دراصل آج کل حالات بڑے خراب ہیں، آپ اکیلے اتنی رقم نہ نکلوائیں تو بہتر ہے۔“ آخر کار وہ تینوں پیسے نکلوا لائے۔ دونوں بھائی اس بات کے لیے خوش تھے کہ ان کی ”تیس روپے والی مچھلی“ اب زندہ سلامت رہے گی۔

پیسے گنتے ہوئے دکان دار نے پوچھا۔ ”آپ ایکوریم کس طرح لے کر جائیں گے؟“ ”اچھا چلیں، میں جنید کو کہتا ہوں کہ

کوئی ٹیکسی رکوائے۔'' اور پھر چلّایا۔ ''جنید، جنید بیٹا! کوئی اچھی حالت والی ٹیکسی تو پکڑنا جس کے اوپر جنگلہ بھی ہو۔ یہ ایکوریم گاڑی کے اندر تو پورا نہیں آئے گا۔'' جنید حکم کی تعمیل کرتے ہوئے خاموشی سے ٹیکسی رکوانے سڑک کی جانب چلا گیا۔

''اور ہاں یاد آیا...... مجھے ذرا بتائیں کہ آپ کی کون سی والی مچھلی تھی؟'' یہ کہتے ہوئے وہ اس ایکوریم کے قریب پہنچ گیا جہاں رنگ برنگی چھوٹی چھوٹی مچھلیاں تھیں۔ ثاقب نے خوشی خوشی ایک حرکت کرتی ہوئی چھوٹی سی مچھلی کی جانب اشارہ کیا۔ ''انکل یہ والی......''

دکان دار نے ایکوریم میں ہاتھ ڈالا اور بڑی مہارت سے اس چھوٹی سی مچھلی کو پانی میں سے نکال کر پولی تھین بیگ میں ڈال دیا۔

''یہ آپ کے لیے میری طرف سے تحفہ۔''

دونوں بھائی ایک بار پھر دکان دار کے اس خلوص سے بے پناہ متاثر ہوئے۔ عاقب حیرانی سے پوچھنے لگا۔ ''شکریہ انکل، مگر آپ نے اسے الگ بیگ میں کیوں ڈال دیا؟ ان چاروں مچھلیوں کے ساتھ کیوں نہیں ڈالا؟''

''بیٹا! وہ تو بڑی بڑی مچھلیاں ہیں۔ آپ نے دیکھا نہیں، میں نے یہاں بھی انہیں الگ الگ ایکوریم میں رکھا ہوا ہے۔'' اس بار ثاقب حیرت میں مبتلا ہو گیا۔ ''تو پھر انکل یہ ہمارے ایکوریم میں کیسے اکٹھی رہیں گی؟''

''بیٹا یہ تو آپ نے بڑی سمجھ داری کی بات کی۔ بڑی مچھلیاں تو فوراً آپ کی چھوٹی والی مچھلی کو ہڑپ کر جائیں گی۔''

ثاقب اور عاقب ایک بار پھر فکرمندی کے سمندر میں غوطے کھانے لگے۔ اسی دوران دکان دار اپنے شیلفوں پر اِدھر اُدھر نظر دوڑانے کے بعد فوراً ایک چھوٹے سے بال نما گول شیشے کے مرتبان کی جانب لپکا۔

''آپ فکر نہ کریں، اپنی والی چھوٹی مچھلی اور یہ مچھلی جو میں نے آپ کو تحفہ دی ہے، اس چھوٹے اور خوب صورت سے ایکوریم میں رکھ دیں۔'' ساتھ ہی اس نے چند پلاسٹک کے پھول، سبز سمندری پودے اور کچھ کنکر اس کی تہہ میں رکھ دیے۔

''آپ اس میں پانی ڈالیں گے تو دیکھنا کتنا خوب صورت دکھائی دے گا۔''

چنانچہ ''تیس روپے والی مچھلی'' کا اب مناسب انتظام ہوا تھا جو بیس ہزار کا بڑا سا ایکوریم لیے بغیر بھی ہو سکتا تھا۔ دکان دار اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے بولا۔ ''ویسے تو اس کی قیمت تین سو روپے ہے مگر آپ صرف دو سو روپے دے دیں...... مچھلی اور اندر کی ڈیکوریشن میری طرف سے تحفہ ہیں۔''

عاقب نے پانچ سو روپے بلا جھجک دکان دار کی جانب بڑھا دیے کیوں کہ اگر دو سو روپے نہ خرچ جاتے تو تیس روپے والی مچھلی بڑی مچھلیوں کا تر نوالہ بن جاتی۔ دکان دار نے تین سو کی بجائے دو سو روپے واپس کرتے ہوئے کہا۔ ''اوہو، آپ لوگ مچھلیوں کی خوراک لینا تو بھول ہی گئے۔ بڑی مچھلیاں تو کافی خوراک لیں گی۔ یہ ایک بڑا پیکٹ سو روپے میں رکھ لیں۔ روزانہ دو تین چٹکیاں بھر کر بڑے والے ایکوریم میں ڈالتے رہیے گا...... اور ہاں چھوٹے والے مرتبان کا پانی ہر دوسرے دن بدل دیا کرنا ورنہ چھوٹی مچھلیاں گندگی کے باعث مر جائیں گی۔ ان کے لیے آٹھ دس دانے ہی کافی ہوں گے۔'' اگر عاقب اور ثاقب اپنے ماموں کے ہمراہ آتے تو دکان دار انہیں اتنا الو نہ بنا پاتا۔ ٹیکسی آ چکی تھی۔ بڑا والا ایکوریم بڑی احتیاط اور مہارت کے ساتھ دکان دار نے ٹیکسی کی چھت پر گتے وغیرہ رکھ کر باندھ دیا اور ڈرائیور کو احتیاط سے چلانے کی نصیحت کی۔ دونوں بھائیوں نے مچھلیوں والا ایک ایک بیگ اپنے ہاتھوں میں پکڑا ہوا تھا۔ خوشی خوشی دکان دار کو خدا حافظ کہتے ہوئے وہ ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ ثاقب بولا۔ ''واہ بھائی، آج تو ہم دونوں نے کمال کر دیا، سب کچھ بڑا زبردست ہے اور مناسب پیسوں میں اتنا کچھ مل گیا...... امی بھی خوش ہوں گی۔''

عاقب نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھے فخر کے ساتھ گردن پیچھے کی جانب موڑی اور کہا۔ ''بس تم میرے ساتھ رہو گے تو یونہی سمجھ دار ہوتے جاؤ گے۔''

ٹیکسی حرکت میں آئی اور ٹریفک کا حصہ بن کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ دکان دار نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے سکھ کا سانس لیا اور سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''یا اللہ تیرا شکر ہو، تو دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کے دیتا ہے......'' اس کے بازو اور سینے کے درمیان جیب تھی جس میں اس نے ابھی ابھی بیس ہزار تین سو روپے رکھے تھے☆

مردِ مسلمان

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان، نئی آن
گفتار میں، کردار میں، اللہ کی بُرہان!
قہاری و غفاری و قُدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان!
ہمسایۂ جبریلِ امیں بندۂ خاکی!
ہے اس کا نشیمن، نہ بخارا نہ بدخشان!
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے قرآن!
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دُنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان!
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو، وہ شبنم!
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں، وہ طوفان!
فطرت کا سرودِ ازلی اس کے شب و روز
آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمٰن!
بنتے ہیں مری کارگہِ فکر میں انجم
لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان

علامہ اقبالؒ

ارشد اور نعمان ہم عصر اور گہرے دوست ہیں۔ دونوں اقبال ٹاؤن کے علاقے میں رہائش پذیر ہیں اور ایک ہی اسکول سے پڑھتے ہیں۔ ایک دن دونوں نے اکٹھے کچھ سودا سلف لینے کا پروگرام بنایا۔ ارشد اور نعمان کے پاس کچھ رقم تھی۔ ارشد نے نعمان کو کہا کہ اگر آپ مجھے پندرہ روپے دے دیں تو میرے پاس آپ کی رقم سے دُگنی رقم ہو جائے گی۔ نعمان نے ارشد سے کہا کہ اگر آپ مجھے پندرہ روپے دے دیں تو میرے پاس آپ کی رقم سے پانچ گنا رقم ہو جائے گی۔

پیارے بچو! آپ کھوج لگا کر بتائیں کہ ہر ایک کے پاس کتنی رقم ہے؟

اکتوبر 2013ء میں شائع ہونے والے ''کھوج لگائیے'' کا صحیح جواب یہ ہے: پہلے آدمی کے پاس 5 روٹیاں اور دوسرے کے پاس 3 روٹیاں تھیں۔ یہ آٹھ روٹیاں تین آدمیوں میں برابر تقسیم کرنے کے لیے ہر روٹی کے 3،3 برابر ٹکڑے کیے گئے۔ گویا آٹھ روٹیاں 24 برابر ٹکڑوں میں کاٹ دی گئیں۔ اب یہ ٹکڑے روٹیوں والے دو اشخاص اور اجنبی کے درمیاں یوں تقسیم ہوئے:

5 روٹیوں والے کے لیے= 8 ٹکڑے، 3 روٹیوں والے کے لیے= 8 ٹکڑے، اجنبی کے لیے= 8 ٹکڑے، کل تعداد= 24 ٹکڑے

اجنبی نے 8 ٹکڑے کھا کر 8 درہم ادا کیے۔ گویا ایک ٹکڑا ایک درہم کا ٹھہرا۔ تین روٹیوں والے شخص نے ان 3 روٹیوں یا 9 ٹکڑوں میں سے 8 تو خود کھا لیے تھے اور صرف ایک ٹکڑا اجنبی کو دیا تھا جبکہ 5 روٹیوں والے نے 5 روٹیوں یا 15 ٹکڑوں میں سے 8 خود کھائے اور 7 ٹکڑے اجنبی کو دے دیے۔ لہٰذا روٹیوں کے 8 ٹکڑوں کے عوض اجنبی نے جو آٹھ درہم دیے ان میں سے 7 درہم کا حقدار پانچ روٹیوں والا تھا جبکہ اپنی 3 روٹیوں میں سے صرف ایک ٹکڑا اجنبی کو دینے والا شخص صرف ایک ہی درہم کا مستحق ٹھہرا تھا۔ حضرت علیؓ کا فیصلہ اسی استحقاق اور میرٹ کا آئینہ دار تھا۔

اکتوبر 2013ء کے کھوج لگائیے میں قرعہ اندازی کے ذریعے درج ذیل بچے انعام کے حق دار قرار پائے ہیں:

1۔ صبا ضیاء، اسلام آباد
2۔ شفیق فاطمہ، راول پنڈی
3۔ محمد ہمایوں طارق، ملتان
4۔ اسامہ ظفر رانجھا، جہلم
5۔ حسان آصف، لاہور

میری زندگی کے مقاصد

ریان طاہر، لاہور
میں بڑا ہو کر پائلٹ بنوں گا اور ملکی سرحدوں کی حفاظت کروں گا۔

محمد حبیب الرحمٰن صدیقی، اسلام آباد
میں بڑا ہو کر آرمی آفیسر بنوں گا اور ملک کی حفاظت کروں گا۔

اسد علی انصاری، ملتان
میں قلم اور علم کے ذریعے معاشرے میں مثبت تبدیلیاں لاؤں گا۔

طٰہٰ عبداللہ، چیچل کلاں
میں جسٹس بن کر سچ کا علم بلند کروں گا۔

گل نور ارسلان، راول پنڈی
میں اچھے کھانے پکاؤں گی اور کوکنگ ایکسپرٹ بنوں گی۔

محمد ابراہیم، سرگودھا
میں پائلٹ بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

محمد حمزہ، فیصل آباد
میں ڈاکٹر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

احتشام اسلم، لاہور
میں بڑا ہو کر انجینئر بنوں گا اور ملک و قوم کا نام روشن کروں گا۔

محمد حماد نصیر، رحیم یار خان
میں ڈاکٹر بن کر ملک و قوم کا نام روشن کروں گا اور غریبوں کا مفت علاج کروں گا۔

محمد ارشاد، لاہور
میں بزنس مین بن کر سنت نبویؐ کے مطابق کاروبار کروں گا۔

سیدہ نور المنتہٰی، راول پنڈی
میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج کروں گی۔

زوبیہ افتخار، راول پنڈی
میں ڈاکٹر بن کر دکھی انسانیت کی خدمت کروں گا۔

سید حسن عسکری، جھنگ
میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج کروں گا۔

صفا رشید، کراچی
میں بڑی ہو کر رپورٹر بنوں گی اور معاشرتی برائیوں کو بے نقاب کروں گی۔

علیشبہ عثمانی، کراچی
میں ٹیچر بنوں گی اور علم کی روشنی پھیلاؤں گی۔

سمید نذر، سیال کوٹ
میں پولیس مین بن کر معاشرے سے جرائم ختم کروں گا۔

مشعال مریم، اسلام آباد
میں فیشن ڈیزائنر بننا چاہتی ہوں۔

اریب افتخار، واہ کینٹ
میں الیکٹریکل انجینئر بن کر ملک کا نام روشن کروں گا۔

سارہ روحی، گوجرانوالہ
میں حافظہ بن کر دین کے علم کی روشنی پھیلاؤں گی۔

ایمن ہنگیال، ملتان
میں ڈاکٹر بن کر دکھی انسانیت کی خدمت کروں گی۔

اعجاز احمد، پشاور
میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا۔

حماد علی، وار برٹن
میں بڑا ہو کر فوجی بنوں گا اور ملک و قوم کی حفاظت کروں گا۔

عاشہ علی خان بابر، پشاور
میں ڈاکٹر بن کر دکھی انسانیت کی خدمت کروں گی۔

احسن علی، لاہور
میں بڑا ہو کر پائلٹ بنوں گا۔

محمد عمیس تنویر، کلور کوٹ
ایک اچھا مسلمان اور پاکستانی شہری بننا پسند کروں گا۔

پہلا پاگل: لوگ چاند پر جا چکے ہیں، اب ہم کہاں جائیں۔
دوسرا پاگل: ہم سورج پر چلے جائیں گے۔
پہلا پاگل: مگر وہ تو بہت گرم ہوتا ہے۔
دوسرا پاگل: ہم رات کو چلے جائیں گے، جب دھوپ ختم ہو جائے گی۔
(عزہ مریم، اخلاص)

ایک دوست (دوسرے سے): آملیٹ کسے کہتے ہیں؟
دوسرا دوست: جو آم لیٹ پکے، اسے آملیٹ کہتے ہیں۔
(انصر علی، وہاڑی)

ایک سائیکل سوار تیزی سے ایک شخص کے قریب سے گزرا اور پھر واپس آ کر بولا: آپ نے مجھے پہچانا؟
پہلا شخص: معاف کیجیے! میں نے نہیں پہچانا۔
سائیکل سوار: میں وہی ہوں جو ابھی ابھی آپ کے پاس سے گزرا تھا۔
(منیبہ عارف، ڈجکوٹ)

ایک مسافر نیا نیا شہر میں آیا۔ وہ ایک ہوٹل میں کھانا کھانے گیا۔ بیرے نے آ کر پوچھا: آپ کو کیا چاہیے؟
مسافر: ایک پلیٹ تلی ہوئی مچھلی اور ہمدردی کے دو بول۔
تھوڑی دیر بعد بیرا پلیٹ میں مچھلی لایا اور میز پر رکھ دی اور مسافر کے کان میں کہا: مچھلی نہیں کھانا...... باسی ہے۔
(عروج ماہین، سرگودھا)

علی: تمہارے بال کیوں گر رہے ہیں؟
صابر: فکر ہے۔
علی: فکر کس بات کی ہے؟
صابر: بال گرنے کی۔
(مومنہ احمد، کراچی)

ایک صاحب (اپنے نوکر سے): وہ کون سی چیز ہے جو باوجود محنت کے نہیں ملتی؟
نوکر: جناب! میری تنخواہ۔
(آمنہ فضل، فیصل آباد)

ایک صاحب ہوائی جہاز میں سوار ہونے جا رہے تھے۔ جب انہوں نے سیڑھیوں پر قدم رکھا تو ائیر ہوسٹس نے ان کو روکنے کے لیے کہا: ویٹ پلیز! صاحب نے برجستہ جواب دیا: ایک سو ساٹھ پونڈ۔
(نعیم علی، میاں والی)

ایک دوست (دوسرے سے): بتاؤ پرچہ کیسا کر کے آئے ہو؟
دوسرا دوست: خالی دے کر آیا ہوں۔ تم بتاؤ تمہارا کیسے ہوا؟
پہلا دوست: میں بھی خالی دے کر آیا ہوں۔
دوسرا دوست: غضب ہو گیا وہ سمجھیں گے کہ ہم نے نقل کی ہے۔
(عالیہ نثار، لاہور)

ڈاکٹر مریض سے: آپ نے مجھے پہچانا؟
ڈاکٹر: نہیں!
مریض: ایک سال پہلے میں آپ کے پاس آیا تھا۔ مجھے نمونیا تھا اور آپ نے مجھے نہانے سے منع کیا تھا؟ کیا اب میں نہا لوں۔
(ظل ہما، جھنگ)

گاہک (ہوٹل کے مالک سے): یہ تولیا بہت گندہ ہے، یہ ہاتھ صاف کرنے کے قابل نہیں ہے۔
مالک: جناب! صبح سے 100 آدمی اس سے ہاتھ صاف کر چکے ہیں۔ کسی نے شکایت نہیں کی۔
(جنید علی، ملتان)

ایک صاحب کو تصویر بنانا نہیں آتی تھی۔ ایک دن انہوں نے اپنے دوست کی الٹی سیدھی لکیریں کھینچ کر عجیب سی تصویر بنا ڈالی پھر تصویر دیکھ کر انہوں نے افسوس سے گردن ہلائی اور آہستہ سے کہا: آہ! اسلم تم کتنے بدل چکے ہو۔
(انعم طارق، لاہور)

جیل کے افسر نے نئے قیدی سے پوچھا: تم یہاں کیوں لائے گئے ہو؟
قیدی بے نیازی سے بولتے ہوئے: جی حافظے کی کمزوری کی وجہ سے۔
جیل کا افسر: حافظے کی کمزوری؟ میں سمجھا نہیں۔
قیدی: دراصل میں چوری کرتے وقت یہ بھول گیا تھا کہ اس گھر کے قریب تھانہ بھی ہے۔
(سلمان رفیق، گوجرانوالہ)

☆☆☆

کھیل دس منٹ کا

ل	ق	ف	ش	ک	ت	ج	د	ی	م
ث	ج	ض	ڑ	ظ	ا	غ	ش	ف	ڈ
م	ر	ق	ٹ	ص	ر	ے	ل	س	خ
ع	و	ت	ش	گ	ڈ	ح	ب	ص	پ
ی	س	ژ	ا	ء	ظ	ج	و	ذ	ن
ش	ر	ف	م	پ	ر	و	ش	ن	ی
ب	ڈ	ط	ی	ح	ض	م	غ	ط	ل
ن	ص	ے	س	و	ی	ر	ا	ر	ث
م	چ	ٹ	ی	ج	ک	و	گ	ح	ظ
ض	ظ	د	ن	ا	چ	ڈ	م	س	ل

آپ نے حروف ملا کر دس نام تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان ناموں کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن ناموں کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں۔

شام، سویرا، صبح، رات، روشنی، سورج، چاند، سحر، شفق، شبنم

نیلی روشنی کا راز

آفتاب احمد

ساتویں قسط

خطرناک سفر

ندیم اور ضرار چٹان سے نیچے اتر آئے تھے۔ چھت پر رسّی واپس کھینچ لی گئی تھی۔ جونہی انھوں نے زمین پر قدم رکھا ان کے پاؤں زمین میں دھنسنے لگے۔

"میرے اللہ!" ضرار نے آہستہ سے ندیم سے کہا۔ "کیپٹن ہمارے قدموں تلے تو دلدل ہے۔"

"نہیں، میرے خیال میں یہ دلدل نہیں۔" ندیم نے کہا۔ "کبھی پہاڑوں پر بھی دلدل ہوا کرتی ہے؟ اگر دلدل ہوتی تو یہاں درخت کیسے اُگ سکتے تھے۔"

ضرار خاموش رہا۔ دونوں کے پاؤں زمین میں دھنس گئے تھے۔ ندیم نے زور لگا کر ایک پاؤں اٹھانے کی کوشش کی تو دوسرا پاؤں آدھی پنڈلی تک زمین میں دھنس گیا۔ ضرار کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ دلدل ہے۔ اس نے کہیں پڑھا یا سنا تھا کہ دلدل میں پھنسنے کی صورت میں زور نہیں لگانا چاہیے بلکہ چت لیٹ جانا چاہیے۔ وہ چت لیٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ندیم گھٹنوں سے ذرا نیچے تک زمین میں دھنس چکا تھا۔ موت سامنے نظر آ رہی تھی۔

تین چار منٹ تک وہ دلدل سے نکلنے کے لیے کوشش کرتے رہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ اچانک ضرار کو ایک خیال آیا اور اس نے اپنی بندوق سے ہوا میں تین فائر کیے۔ خوش قسمتی سے چھت پر ابھی تک جہاز کھڑا تھا۔ فوراً ہی بلال نے اوپر سے جھانک کر کہا۔ "کیا ہے؟"

"دلدل! دلدل۔" ضرار نے آواز دی۔

اسی لمحے نیلی شعاع پھر سے چٹان کی چھت پر پڑی اور بلال فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد بلال چھت پر سے چلّایا۔ "کیا ہے؟" "دلدل! دلدل۔ رسّی پھینکو۔" ندیم نے جواب دیا۔

بلال نے یہ بات دوسروں کو بتائی تو وہ حیران سے رہ گئے۔ اچانک لالہ غنی بولا۔ "اوہ میرے اللہ! اس چٹان کے نیچے تو واقعی ایک کنویں کے گھیر کے برابر دلدلی جگہ ہے۔ جب ان تبتّیوں میں سے کوئی کسی کو قتل کرتا ہے تو وہ اسے سزا کے طور پر اس چٹان سے گرا کر دلدل میں پھینک دیتے ہیں۔ اُف! جلدی رسّی پھینکو، ورنہ وہ دھنس جائیں گے۔"

بلال نے رسّی لٹکا کر آواز دی۔ "یہ ساری جگہ دلدل نہیں

ہے۔ رسّی پکڑ کر صرف چند فٹ اوپر آنا، ہم رسّی کو دوسری طرف کر دیں گے۔ وہاں اتر جانا۔“

سب نے زور لگا کر پہلے ندیم کو دلدل سے نکالا، کیوں کہ وہ گھٹنوں دلدل میں دھنس چکا تھا۔ اسے زمین سے پانچ چھ فٹ اونچا لانے کے بعد بلال نے آواز دی۔ ”اس چٹان پر پاؤں رکھ کر دوسری جگہ کود جاؤ۔“ ندیم بچ گیا تھا۔ اس کے بعد ضرار کو بھی انھوں نے اسی طرح نکالا۔

دلدل سے باہر آ کر دونوں نے اپنی ٹانگیں صاف کیں اور پھر چل کھڑے ہوئے۔ دس قدم پر سے پکا راستہ تھا، وہ بڑی احتیاط سے قدم اٹھا رہے تھے۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

”گھرر گھرر“ اچانک شاہین کے سٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور وہ دونوں اچھل پڑے۔ پھر اس گھبراہٹ پر دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ ”کیپٹن، ہمیں ان پتھروں سے جلد سے جلد نکل کر اس راستے پر پہنچنا چاہیے کیوں کہ یہی وہ راستہ ہے جس پر آگے جا کر چوٹی آتی ہے۔“ ضرار بولا۔

”بیٹھ جاؤ۔“ ندیم نے آہستہ سے کہا۔ دونوں ایک پتھر کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئے۔ ان کے قریب سے دو تبتی گزر رہے تھے اور چٹان کی جانب جا رہے تھے۔

”ان کے ہاتھوں میں کیا ہے؟“ ضرار نے پوچھا۔

”آہستہ بولو۔“ ندیم نے کہا۔ ”میرے خیال میں یہ نیلی شعاعیں پھینکنے والی ٹارچیں ہیں اور یہ لوگ ہماری چٹان کی طرف جا رہے ہیں۔“

”ایک دو تین...... ڈز ڈز۔“ ضرار نے بندوق چلائی اور دونوں تبتی خون میں لت پت تڑپنے لگے۔ ضرار اور ندیم بھاگ کر ان کی لاشوں کے پاس گئے اور انھیں گھسیٹتے ہوئے پتھر کے پیچھے لے آئے۔ پہلے انھوں نے ان کی وردیاں اتاریں اور پھر لاشوں کو دلدل میں پھینک دیا۔ ان کی جیب سے ایک ایک ٹارچ نکلی۔ انھوں نے ٹارچوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کر دیا۔ اچانک ندیم کے ہاتھ کو ایک جھٹکا لگا اور ڈبا زمین پر گر گیا۔

”کیا بات ہے کیپٹن؟“ ضرار نے خوف زدہ ہو کر پوچھا۔

”میرا ہاتھ بے خبری میں کسی بٹن سے چھو گیا تھا۔“ ندیم نے کہا۔ ”ٹارچ میں سے نیلی شعاع نکل کر میرے ہاتھ پر لگی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہاتھ پر کسی نے ہتھوڑا مار دیا ہو۔“ ندیم نے پھر ٹارچ اٹھائی اور بڑی احتیاط سے اس کا جائزہ لینے لگا۔

تھوڑی دیر بعد ندیم خوشی سے چلایا۔ ”ضرار، مجھے ٹارچ کے استعمال کا طریقہ معلوم ہو گیا ہے۔ دائیں طرف والے بٹن کو دبانے سے شعاعیں نکلتی ہیں اور بائیں طرف والے بٹن کو دبانے سے بند ہو جاتی ہیں۔ یہ دیکھو!“ ندیم نے شعاع کو نکال کر اور پھر بند کر کے دکھایا۔ اس کے بعد دونوں نے تبتیوں کی وردیاں پہن لیں اور اپنے کپڑے دلدل میں پھینک دیے۔

”آپ تو بالکل تبتی معلوم ہوتے ہیں کیپٹن۔“ ضرار نے کہا۔

”اور تم بھی تو۔“ ندیم نے مسکرا کر کہا۔

”کیپٹن ذرا خیال رکھیے گا۔ کہیں مجھے تبتی سمجھ کر گولی کا نشانہ نہ بنا دیجیے گا۔“ ضرار نے کہا۔

”ممکن ہے بھاگ دوڑ میں ہم ایک دوسرے سے بچھڑ جائیں اور جب دوبارہ ملیں تو دُور سے پہچان نہ سکیں۔ آؤ ہم اپنی بائیں کلائی پر رومال لپیٹ لیں تاکہ فوراً پہچانے جا سکیں۔ ہم ان کی ٹوپیاں بھی ذرا ٹیڑھی پہنیں گے کیوں کہ یہ تبتی ٹوپی کو سر پر بالکل سیدھا رکھتے ہیں۔“ ندیم نے کہا۔

انھوں نے جھٹ پٹ اپنی بائیں کلائیوں پر سفید رومال لپیٹے اور ٹوپیاں سر پر ذرا ٹیڑھی کر کے رکھ لیں۔ اب وہ چوٹی کی طرف جانے والے راستے پر آ گئے تھے۔ ضرار کچھ کہنے لگا تھا کہ ندیم نے اشارے سے اسے چپ کرا دیا۔

”قدموں کی چاپ سنتے ہو؟ کوئی آ رہا ہے۔“ ندیم نے کہا۔

کوئی پچاس ساٹھ تبتی ہاتھوں میں نیلی شعاعوں کی ٹارچیں لیے ان کی طرف آ رہے تھے۔ ندیم نے رائفل کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور آہستہ سے کہا۔ ”ضرار، بندوق تھام کر اس پتھر کے پیچھے ہو جاؤ۔ میں ان کا راستہ روکتا ہوں، اب تبتی بالکل قریب آ گئے تھے۔

”فائر۔“ ندیم نے چلّا کر کہا۔ ادھر رائفل اور ادھر دو نالی بندوق آگ اُگلنے لگی۔ دونوں نے پلک جھپکتے ہی دس بارہ تبتیوں کو زمین پر

گرا دیا تھا۔ کچھ تبتی بھاگ رہے تھے۔ کچھ زمین پر پڑے تڑپ رہے تھے۔ وادی گولیوں کی آواز سے گونج اٹھی تھی۔ ندیم اور ضرار لاشوں کو پھلانگتے ہوئے آگے بڑھے۔ اچانک پیچھے سے کسی کے گھسٹنے کی آواز آئی۔ ندیم نے مڑ کر دیکھا اور ایک لمحے کے لیے اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ تین زخمی تبتی گھسٹتے ہوئے ندیم کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ٹارچیں تھیں۔ ایک شعاع نکلی اور ندیم کے گھٹنے پر ہتھوڑے کی طرح لگی۔ ''آہ'' ندیم نے چیخ ماری اور زمین پر گر پڑا۔ اس نے پھرتی سے رائفل کا رخ ان تبتیوں کی طرف کر دیا تھا لیکن اس وقت تک ایک اور تبتی ضرار پر شعاع گرا چکا تھا۔ ''اُف..... آہ۔'' ضرار نے چیخ ماری اور اس کی بندوق ہوا میں اچھل گئی۔ ندیم کی رائفل پھر شعلے اگلنے لگی۔ زخمی تبتی منہ کے بل گرے اور تڑپنے سے پہلے ہی ٹھنڈے ہو گئے۔

''صبر کرو ضرار!'' ندیم نے اس کو زمین پر سے اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہمیں گھیرا ڈال کر گرفتار یا ہلاک کرنا چاہتے تھے۔ اگر ہم صحیح وقت پر وہاں سے نہ نکل آئے ہوتے تو خدا جانے کیا ہوتا۔''

اچانک خطرے کا سائرن بجنے لگا۔ ''میرے خیال میں جو تبتی یہاں سے بچ کر بھاگ گئے تھے انھوں نے اپنے ساتھیوں کو اطلاع کر دی ہے۔'' ضرار نے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں ان ٹارچوں سے کام لینا چاہیے۔'' ندیم نے کہا۔ ''آہ'' ضرار کے گھٹنے میں درد ہو رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اب ہزاروں تبتی یہاں آ جائیں گے۔'' ندیم نے کہا۔ ''ٹھہرو! میں اس پتھر پر چڑھ کر دیکھتا ہوں۔''

''اوہ میرے خدا۔'' ندیم نے کہا۔ ''یہ تو فوج کی فوج آ رہی ہے۔ مجھے زندگی میں کبھی ایسی لڑائی پیش نہیں آئی۔ ان کے پاس ٹارچیں بھی ہیں۔ آؤ ہم بھی ٹارچیں اکٹھی کریں۔''

دونوں مردہ تبتیوں کی ٹارچوں کو جلدی جلدی الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ دس ٹارچیں بالکل صحیح حالت میں تھیں۔ ندیم نے کہا۔ ''میں راستے کے دائیں طرف اس پتھر کے پیچھے رائفل لے کر بیٹھا ہوں۔ تم بائیں جانب اس پتھر کے پیچھے بیٹھو اور ٹارچوں کو ایک قطار میں لگا کر ان کے منہ آنے والے لوگوں کی طرف کر دو۔ جب میں فائر کھولوں تو تم پھرتی سے ان سب ٹارچوں کے بٹن دبا دبا کر شعاعیں ان پر پھینکنا شروع کر دینا۔''

ندیم بھاگ کر پتھر کے پیچھے چلا گیا۔ ضرار بھی ٹارچوں کو ایک قطار میں لگا کر ان کے منہ راستے پر لگا چکا تھا۔ فوج قریب آتی جا رہی تھی۔ ندیم بے چینی سے آنے والوں کا انتظار کر رہا تھا۔ اب فوج راستے پر اسی طرف آتی ہوئی دکھائی دینے لگی تھی۔ ضرار نے ایک ہاتھ میں بندوق تھام رکھی تھی۔ دونوں مرنے مارنے پر تل چکے تھے۔ اب تبتی ان سے دس قدم کے فاصلے پر آ چکے تھے۔ ندیم سانس روکے بیٹھا تھا۔

''فائر۔'' ندیم اچانک زور سے چلایا۔ ''ڈز ڈز۔ ٹھائیں ٹھائیں۔'' ندیم کود کر راستے پر آ گیا تھا۔ ادھر اس کی رائفل، ضرار کی بندوق اور نیلی شعاعوں نے تباہی مچا دی تھی۔ تبتی گاجر مولی کی طرح گر رہے تھے۔ چیخوں اور بندوقوں کی آواز سے خوف ناک سماں بندھ گیا تھا۔ دس منٹ تک تبتی گرتے رہے۔ پھر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اب ضرار بھی دونوں ہاتھوں میں چار ٹارچیں پکڑے پتھر سے نکل کر راستے کے درمیان میں آ گیا تھا۔

''پیچھا کرو۔'' ندیم نے بھاگتے ہوئے تبتیوں کے پیچھے جاتے ہوئے ضرار سے کہا۔ نیلی شعاعیں رائفل کی گولیوں سے زیادہ کام کر رہی تھیں۔ دونوں ان کے پیچھے بھاگتے ہوئے کافی دُور نکل گئے۔

''میرے خیال میں ہم کافی دُور آ گئے ہیں۔ واپس چلنا چاہیے۔'' ندیم نے کہا۔ سارا راستہ لاشوں سے پٹ گیا تھا۔ یہاں انھوں نے وہی جھیل دیکھی جس کے نیچے دُنیا کا سب سے خطرناک اڈا بنا ہوا تھا۔ یہاں سے کوہِ نور بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ نیلی شعاعوں والی چوٹی اب صاف دکھائی دے رہی تھی۔ دونوں واپس آ رہے تھے۔ تبتیوں کا پیچھا کرتے ہوئے وہ چوٹی سے آگے نکل گئے تھے۔ اب وہ واپس اسی طرف جا رہے تھے۔

''ضرار، اللہ نے ہمیں بہت بڑی فتح دی ہے لیکن ہمارا کام پورا نہیں ہوا۔ ہمیں نیلی شعاعوں والی ٹارچ کو ختم کرنا ہے اور یہ کام کم خطرناک نہیں ہے۔''

ندیم کے کندھے پر رائفل رکھی تھی اور ضرار نے ایک ہاتھ میں دو ٹارچیں اور دوسرے میں بندوق تھام رکھی تھی۔

''آہ!'' ندیم کی چیخ فضا میں بلند ہوئی۔ ایک تبتی کسی پتھر کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ انھیں واپس آتے دیکھ کر اس نے ندیم پر نیلی شعاع پھینکی تھی جو اس کے بازو پر لگی تھی۔ وہ چیخ مار کر زمین پر گرا اور رائفل کندھے سے ڈھلک کر اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس تبتی نے ایک اور شعاع ندیم پر پھینکی۔ ندیم نے رائفل چلانے کی کوشش کی مگر اس کے گھٹنے پر لگی۔ وہ درد کی وجہ سے پھر چیخا اور رائفل اس کے ہاتھ سے نکل کر پرے جا گری۔ ایسا لگتا تھا کہ تبتی ندیم کو ختم کر دے گا لیکن عین اسی وقت ضرار اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے فوراً ہی اپنی ٹارچ کی شعاع تبتی کے ہاتھ پر ڈالی اور وہ اچھل کر اوندھے منہ زمین پر گر پڑا۔ ایک اور شعاع اس پر ڈالنا چاہتا ہی تھا کہ وہ ایک دم اٹھا اور دوڑ کر ضرار سے لپٹ گیا۔ اس وقت تک ندیم بھی سنبھل چکا تھا۔ اس نے اپنی رائفل کا دستہ تبتی کے سر پر مارا مگر تبتی نے اپنا سر ایک طرف کر لیا اور دستہ اس کے سر کے بجائے کندھے پر لگا۔ ضرار کی گردن اس بھاری بھرکم تبتی کے ہاتھوں میں تھی اور وہ پوری قوت سے اسے دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ندیم نے ایک وار اور کیا۔ تبتی کے سر پر چوٹ لگی۔ وہ چیخ مار کر اٹھا اور ندیم کی طرف جھپٹا۔ ندیم کے ہاتھ سے رائفل گر گئی۔ تبتی نے پھرتی سے ٹارچ اٹھائی۔ ندیم کے ہاتھ پر شعاع ڈالی۔ ندیم زمین پر لیٹ گیا۔ ضرار بھی زور لگا کر اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے اپنی بندوق اٹھا کر تبتی پر فائر کر دیا۔ تبتی چیخ مار کر زمین پر گرا اور گرتے ہی ٹھنڈا ہو گیا۔

ضرار زمین پر ادھ موا پڑا تھا۔ اس کی گردن پر انگلیوں کے نشان تھے اور گھٹنے سے خون بہہ رہا تھا۔ ندیم نے آگے بڑھ کر اس کا سر گود میں رکھ لیا اور اسے ہوش میں لانے کے لیے آوازیں دینے لگا مگر ضرار بے ہوش ہو چکا تھا۔

ندیم نے ضرار کو کندھے پر اٹھا کر ایک پتھر کے پیچھے زمین پر لٹا دیا۔ پھر وہ اپنی رائفل اور بندوق لینے کے لیے پگ ڈنڈی پر آیا۔ اچانک اس نے دیکھا کہ دو تبتی بڑی تیزی سے بھاگ رہے ہیں۔ ندیم تھک چکا تھا مگر وہ پھر لڑنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے فوراً ٹارچ اٹھا کر بھاگتے ہوئے تبتیوں پر شعاع پھینکی مگر وہ بہت دُور جا چکے تھے۔ اس نے دو ٹارچیں اٹھائیں اور ضرار کے پاس آ کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں ضرار نے آنکھیں کھول دیں۔ ''ہیں...... ہوں؟ میں کہاں ہوں؟'' ضرار نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''بولو مت۔'' ندیم نے اسے پیار سے چپت لگاتے ہوئے کہا۔

''کہاں ہے وہ بدمعاش؟ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' ضرار نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ندیم مسکرا دیا۔

''وہ سامنے پڑا ہے۔'' ندیم نے اس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

ندیم رائفل اٹھا کر باہر آ گیا۔ تھوڑی دیر اردگرد پھیلی ہوئی لاشوں کو غور سے دیکھنے اور تسلی کر لینے کے بعد کہ ان میں کوئی زندہ نہیں، وہ دونوں نیلی شعاعوں والی چوٹی کی طرف چل پڑے۔ کچھ دُور جا کر انھیں بائیں طرف ایک کچا راستہ نظر آیا۔ یہ راستہ چوٹی کو جانے والے دروازے پر ختم ہوتا تھا۔ دونوں اسی طرف بڑھے۔

''ضرار، بندوق اور ٹارچوں کو تیار رکھنا۔ ہمیں اب آخری لڑائی لڑنی ہے۔ ہمیں چوٹی پر پہنچ کر سب سے بڑی مصیبت یعنی سب سے بڑی ٹارچ توڑنا ہے۔''

''فکر نہ کیجیے کیپٹن، ان شاء اللہ ہم کو فتح ہو گی۔'' ضرار بولا۔

اچانک انھوں نے شاہین کی آواز سنی۔

''کیپٹن، صبح ہو چکی ہے۔ ہمیں جلد کام ختم کر لینا چاہیے۔'' ضرار نے کہا۔ ''شاہین اسی میدان کی طرف جا رہا ہے جہاں ہم نے بلال کو جانے کے لیے کہا ہے۔''

''ہاں۔'' ندیم نے کہا اور وہ دونوں چوٹی پر جانے والے دروازے کی طرف بڑھے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہاں کوئی شخص بھی نہیں تھا۔ بسم اللہ پڑھ کر ندیم نے سیڑھیوں پر قدم رکھا۔

''ایک ٹارچ مجھے دے دو۔ ٹوپی ٹیڑھی کر کے پہن لو تاکہ چہرہ چھپ جائے۔ ہم نے دشمن کی وردیاں پہن رکھی ہیں، پہلی نظر میں وہ ہمیں پہچان نہیں سکیں گے۔ خاموشی سے میرے ساتھ ساتھ آؤ۔'' ندیم نے کہا۔ دونوں سیڑھیاں چڑھتے رہے۔ ایک سو سیڑھیاں چڑھنے کے بعد انھیں دو خالی کرسیاں نظر آئیں۔ یوں لگتا تھا جیسے

ابھی ابھی یہاں سے کوئی اٹھ کر گیا ہے۔

''ہوشیار!'' ندیم نے آہستہ سے کہا۔ ''جب تم بے ہوش تھے تو دو تنتی بھاگ رہے تھے۔ میرے خیال میں وہ ہم سے خوف زدہ ہو کر یہاں سے بھاگے ہیں۔''

ایک سو سیڑھیاں اور چڑھنے کے بعد انھیں دو تنتی کرسیوں پر بیٹھے نظر آئے۔ وہ تاش کھیل رہے تھے۔ انھوں نے سر اٹھا کر دیکھا اور پھر کھیلنے میں مصروف ہو گئے۔ قریب پہنچ کر ندیم نے ضرار کو اشارہ کیا اور دونوں ایک ہی وقت میں ان پر ٹوٹ پڑے۔ ندیم نے بڑے زور سے رائفل کا دستہ ایک تنتی کے سر پر مارا۔ اس کی چیخ نکلنے لگی تھی کہ ندیم نے ایک دم اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور نیچے گرا کر منہ میں رومال ٹھونس دیا۔ ادھر ضرار نے بھی دوسرے تنتی کے سر پر بندوق کا دستہ مار کر اسے بے ہوش کر دیا تھا۔

دونوں پھر اوپر چڑھنے لگے۔ پچاس سیڑھیاں اور چڑھنے کے بعد چوٹی ختم ہو گئی اور ایک چبوترا نظر آیا۔ سامنے دو تنتی دوسری طرف منہ کیے کرسیوں میں بیٹھے تھے۔ چبوترے پر کوئی بہت بڑی مشین چل رہی تھی۔ دونوں آہستہ آہستہ ان کے قریب پہنچ گئے۔ مشین میں سے ہلکی ہلکی گھرررگھررر کی آواز آ رہی تھی۔ ندیم نے ضرار سے کہا۔ ''تم کچھ نہ کرنا۔ ان دونوں سے میں ہی نپٹوں گا۔''

یہ کہہ کر اس نے نشانہ لیا۔ رائفل میں سے ایک ایک کر کے دو گولیاں نکلیں اور دونوں تنتی کرسیوں میں ہی ڈھیر ہو گئے۔ کچھ دیر تک ضرار اور ندیم اس مشین کو دیکھتے رہے، پھر انھوں نے مشین کے تار کاٹے اس کے بعد ندیم نے رائفل سے مشین پر گولیوں کی بارش کر دی اور اس کے کئی پرزوں اور شیشوں کو تباہ کر دیا۔ تھوڑی سی دیر میں خطرناک شعاعیں پھینکنے والی یہ مشین تباہ ہو چکی تھی۔ جانے سے پہلے ندیم نے دونوں جیبی ٹارچوں کے بٹن دبا کر مشین کے اندر رکھ دیے۔

''آدھ گھنٹے میں یہ مشین بسکٹ کی طرح نرم ہو جائے گی۔'' ندیم نے کہا۔ پھر دونوں سیڑھیاں اترنے لگے۔

نیچے آ کر انھوں نے کوہِ نور کی طرف دیکھا۔ اس کی روشنی بہت مدہم ہو چکی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ صبح ہونے والی ہے۔ وہ دونوں مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے دو گھنٹے کے بعد اچانک اپنے ساتھیوں کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔

بلال نے ایک دم ریوالور نکال کر ندیم پر فائر کر دیا۔ ندیم اگر اچھل کر پرے نہ ہٹ جاتا تو گولی اس کا سینہ چیرتی ہوئی نکل جاتی۔ ضرار نے چلا کر کہا۔ ''بلال، یہ کیپٹن ندیم ہیں۔ یہ کیپٹن ندیم ہیں۔'' بلال دوسرا فائر کرنے ہی لگا تھا کہ ضرار کی آواز پہچان کر رک گیا۔ سب حیرت سے ندیم اور ضرار کو دیکھنے لگے۔ ندیم آگے بڑھا اور بلال کے کان مروڑتے ہوئے بولا۔ ''تم نے تو میری جان لے لی تھی۔''

بلال نے کہا۔ ''ہم آپ کو تنتی سمجھے تھے؟''

''خیر تم نے ہوشیاری کا ثبوت دیا ہے۔'' ندیم نے کہا۔ ''یہ وردیاں تمھیں کہاں سے ملیں؟'' چاچی نے حیران ہو کر پوچھا۔

ندیم مسکرایا اور پھر اس نے شروع سے آخر تک اس خطرناک سفر کی کہانی سنائی۔

(باقی آئندہ)

پاؤں کیوں سو جاتا ہے؟

پاؤں میں سوئیاں سی چبھنے لگیں تو ہم کہتے ہیں کہ پاؤں سو گیا ہے۔ یہ اکثر اس وقت ہوتا ہے جب ہم ٹانگیں دوہری کر کے بیٹھے ہوئے ہوں۔ ایک مڑی ہوئی ٹانگ ربڑ کی اس نلکی کی طرح ہوتی ہے جس میں بل پڑ گئے ہوں۔ اس طرح مڑی ہوئی ٹانگ کی خون کی نالیوں میں خون کا بہاؤ کم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مڑی ہوئی ٹانگ کی خون کی نالیوں میں خون کی رفتار سست پڑ جاتی ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنا کام اچھی طرح نہیں کر سکتا۔ ان کاموں میں سے ایک کام جسم کے گندے اور فاسد مادوں کو نکالنا بھی ہے۔ جب یہ گندے اور فاسد مادے اپنی جگہ سے نہیں ہلتے تو وہ ان پٹھوں (اعصاب) کے کام میں رکاوٹ ڈالتے ہیں جن کا کام دماغ کو پاؤں کے حالات سے باخبر رکھنا ہے۔ اس رکاوٹ کی وجہ سے دماغ کا پاؤں سے تعلق ٹوٹ جاتا ہے اور اسی کو ہم پاؤں کا سو جانا کہتے ہیں۔ جب ہم پاؤں سیدھا کر لیتے ہیں تو خون پھر پہلے کی طرح گردش کرنے لگتا ہے اور اعصاب کے ذریعے پاؤں کا تعلق دماغ سے قائم ہو جاتا ہے۔

اگر تو زندگی چاہتا ہے

(کلثوم عتیق، اٹک)

شام کا وقت تھا۔ آسمان گہرے کالے بادلوں سے مکمل ڈھکا ہوا تھا۔ پارک میں خوب گہما گہمی تھی۔ پارک کے ایک کونے میں حیدر، عمر، زین اور معیز بیٹھے پاکستان کے حالات پر بحث کر رہے تھے۔

''اونہہ...... اس ملک میں رہتے ہوئے کچھ اچھا کرنا ممکن نہیں ہے۔ گھر سے باہر نکلو تو صحیح سلامت گھر واپس آنے کی توقع نہ رکھو کیا پتا کسی بم دھماکے کی زد میں آ کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھو۔'' معیز نے نفرت سے کہا۔

''ہاں...... تو اور کیا...... ابھی پچھلے دنوں امریکہ سے میرا کزن احسن آیا تو کہہ رہا تھا کہ پاکستان ویسے تو خوب صورت ملک ہے لیکن رہنے کے قابل ہرگز نہیں ہے۔ ہر وقت جان کا خطرہ، چوری، ڈکیتی، اغواء، غرض انسان بہت سے مسائل میں گھرا رہتا ہے۔ میں تو آج کے بعد پاکستان کبھی دوبارہ نہیں آؤں گا۔'' عمر نے بھی حصہ لیا۔

''یار! سچی بات تو یہ ہے کہ میں بھی ایک لمحے کے لیے اس ملک میں نہیں رہنا چاہتا۔ بس میں تو ابھی سے کوششوں میں لگا ہوا ہوں کہ یورپ چلا جاؤں...... کم از کم کچھ سکھ تو ملے...... چین سے تو جیا جائے۔ ہر انسان کا بنیادی حق ہے کہ وہ سکون سے زندگی گزارے۔'' زین نے بھی اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

حیدر ان کی باتیں سن کر ذرا سا مسکرایا کیوں کہ کبھی اس کے خیالات بھی اپنے انہی دوستوں سے ملتے جلتے تھے...... مگر علامہ اقبالؒ کی ایک فارسی نظم پڑھنے کے بعد وہ تاریکی سے روشنی میں آیا تھا۔ اس نظم نے اس کے ارادوں کو بدل دیا اور اس پر واضح کر دیا کہ مشکلات اور خطرات کا مقابلہ کرنے سے ہی خودی مستحکم ہو سکتی ہے۔ ''ہاں! دوستو...... ویسے بات تو تم لوگوں کی اتنی غلط بھی نہیں ہے...... مگر اس سے پہلے میں تم لوگوں کو ڈاکٹر علامہ اقبالؒ کی ایک نظم نہ سناؤں کیا؟'' حیدر نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔ ''نظم!...... ہاں سناؤ کون سی نظم ہے؟'' معیز نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا کہ ان کی بحث میں علامہ اقبالؒ کی نظم کہاں سے آ گئی۔ ''اچھا تو سنو! علامہ اقبالؒ کی یہ نظم ہرنوں کے مکالمے پر مشتمل ہے۔ اس نظم میں ایک ہرن دوسرے ہرن کو اپنے دل کا دکھ بتاتے ہوئے کہتا ہے کہ میں آج کے حرم (کعبہ) میں پناہ حاصل کر لوں گا کیوں کہ جنگل میں تو ہر وقت شکاری ہماری گھات میں لگا رہتا ہے اور ہم ہرنوں کی مرضی اور خواہش کے مطابق نہ تو صبح ہوتی ہے اور نہ ہی شام...... اور ہمیں صبح و شام کسی بھی وقت چین میسر نہیں ہے۔ میں تو شکاری کی اس مصیبت سے پناہ چاہتا ہوں اور اپنے دل کو ان تمام خطرات سے آزاد دیکھنا چاہتا ہوں۔ تو پتا ہے اس کے دوسرے دوست ہرن نے اس کو کیا جواب دیا؟'' یہاں تک کہہ کر اس نے ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا جو کہ نہایت دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔

''ہاں...... فوراً بتاؤ ناں کہ اس کے دوست ہرن نے کیا جواب دیا؟'' سدا کے جلد باز زین نے بے چینی سے پوچھا۔ حیدر کو اس کے انداز پر ہنسی آ گئی جب کہ زین اور عمر نے چڑ کر حیدر کی طرف دیکھا۔

''اچھا تو سنو!'' اس کے دوست نے کہا۔ ''اے میرے عقل مند دوست! اگر تو زندہ رہنا چاہتا ہے تو خطرات میں رہ کر جی...... ہر لمحے اپنے آپ کو سان پر رگڑتا رہ (سان وہ پتھر ہے جس پر لوہے کے اوزار تیز کیے جاتے ہیں) اور تیز دھار والی عمدہ تلوار سے بھی زیادہ تیز ہو کر جی اور زندگی گزار...... کیوں کہ خطرات تو طاقت اور قوت کے لیے امتحان کی طرح ہوتے ہیں...... سونا اسی وقت سونے کی قیمت پاتا ہے جب وہ کسوٹی پر پرکھے جانے کے بعد کھرا ثابت ہوتا ہے، اسی طرح جب تک کوئی مشکلات و مصائب کا دلیری، حوصلہ مندی اور سخت کوشی سے سامنا نہ کرے، تب تک زندگی اور زندہ رہنے کا صحیح لطف نہیں اٹھا سکتا ہے۔'' یہاں تک کہہ کر حیدر نے ضبط میں لمبی سانس خارج کی اور اپنے

دوستوں کی طرف دیکھا جو کہ اس نظم سے کافی متاثر نظر آئے اور داد دینے والے انداز میں سر ہلا رہے تھے۔

"واقعی یار! اس نظم نے تو ہماری آنکھیں کھول دیں...... وہ بات جو کہ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہی اس نظم نے منٹوں میں سمجھا دی۔ میں تو یہی کہوں گا کہ اقبالؒ زندہ باد! پیارا پاکستان زندہ باد!" عمر نے یہ کہہ کر نعرہ لگایا اور باقی تینوں نے بھی پُر جوش آواز میں نعرہ لگایا۔ یک دم ہلکی ہلکی پھوار شروع ہوگئی اور فضا زیادہ خوشگوار ہوگئی۔

(پہلا انعام:120 روپے کی کتب)

احساس

(عفیفہ طاہر، گجرات)

"ایان...... ایان...... کیا ہوگیا ہے اس لڑکے کو، کوئی بات ہی نہیں سنتا۔" راشد اپنے بیٹے کو بلا رہا تھا۔

"شیرین، تم نے ایان سے بات کی کہ وہ ایسے کیوں کر رہا ہے؟" "میں نے بات کی تھی ایان سے لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔" شیرین نے کہا۔

ایان، راشد اور شیرین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ دونوں اسے بہت پیار کرتے تھے اور اس کے لاڈ اٹھاتے تھے۔ اس کی ہر خواہش پوری کرتے تھے۔ ایان بھی ایک اچھا بچہ تھا۔ وہ ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اپنے ماں باپ کا کہا مانتا تھا لیکن چند دنوں سے اس کا رویہ ٹھیک نہیں تھا۔ وہ اپنے ماں باپ سے بہت بُرے لہجے میں بات کرتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی بات پر اس کو بہت غصہ آتا تھا۔ راشد اور شیرین اس کی حرکتوں پر بہت پریشان تھے۔

آج ایان اسکول سے گھر آ کر اپنے کمرے میں جا رہا تھا کہ راشد نے اسے بلایا لیکن وہ چپ چاپ تیزی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

رات کو ڈائننگ ٹیبل پر راشد اور شیرین بیٹھے ہوئے تھے۔ ایان کو ایک ملازمہ ڈنر کے لیے بلانے گئی تھی۔ پہلے تو وہ نہ آیا لیکن کافی نخروں کے بعد اسے آنا ہی پڑا۔ کھانا دیکھتے ہی اس نے منہ بنایا۔ یہ کیا بنایا ہے، میں نہیں کھاؤں گا۔

"بیٹا کھا کر تو دیکھو اتنے مزے کی ڈش ہے ایک بار کھاؤ گے تو......"

اس سے پہلے کہ راشد اسے مزید کوئی نصیحت کرتا، اس نے پلیٹ اٹھا کر نیچے پھینک دی اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس کی اس حرکت پر راشد کو وہ دن یاد آ گیا جب اس نے اپنے ابو سے اسی طرح بدتمیزی سے بات کی تھی۔

دراصل راشد جب چھوٹا تھا تب وہ لوگ بہت غریب تھے۔ ان کی آمدن بہت کم تھی۔ راشد یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے ماں باپ بڑی مشکل سے گھر کے اخراجات برداشت کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اپنی خواہشیں ضرور پوری کرواتا تھا۔ ایک دن جب وہ لوگ دوپہر کا کھانا کھانے لگے تو اس دن کھانا اتنا اچھا نہیں تھا۔ "یہ کیا بنا دیا ہے آج کھانے میں، میں نہیں کھاؤں گا یہ زہر۔" راشد اپنے والدین سے تلخ لہجے میں بات کر رہا تھا۔ "بیٹا! تمہیں پتا ہے کہ ہمارے مالی حالات اتنے اچھے نہیں ہیں کہ ہم دو وقت کا کھانا سکون سے کھا سکیں۔ اتنی مشکل سے میں پیسے کما کر لاتا ہوں۔ اسی سے پورے مہینے کا خرچہ چلانا ہوتا ہے......" "میں کچھ نہیں جانتا، میں نہیں کھاؤں گا۔" راشد سب کچھ جاننے کے باوجود ضد کر رہا تھا۔

اب راشد کو احساس ہوا کہ آج مجھے ایان کے اس رویے پر اتنا دکھ ہو رہا ہے تو کیا میرے والد کو میرے رویے پر دکھ نہیں ہوا ہوگا۔

راشد نے اپنے والد کو اولڈ ہاؤس شفٹ کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنے بیٹے راشد کو پال پوس کے اتنا بڑا کیا تھا۔ خود تکلیف اٹھا کر اس کی ہر خواہش پوری کی اور جب ان کے بڑھاپے کا وقت آیا تو راشد نے ان کو سہارا دینے کی بجائے انہیں بے سہارا کر دیا۔ ان کی خدمت کرنے کی بجائے انہیں اولڈ ہاؤس شفٹ کر دیا۔ آج راشد کو اس بات کا احساس ہوا۔ اس نے گاڑی نکالی اور فوراً اولڈ ہاؤس چلا گیا۔

اولڈ ہاؤس جا کر اس نے اپنے باپ سے اپنے کیے کی معافی مانگی۔ اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا تھا۔ وہ رو رو کر اپنے باپ سے معافی مانگ رہا تھا۔ والدین اپنی اولاد سے کتنے بھی ناراض کیوں نہ ہوں، اولاد کو آخرکار معاف کر ہی دیتے ہیں۔ راشد کو اس کے والد نے معاف کر دیا تھا۔ اب راشد ان کو گھر لے آیا۔

راشد جب اپنے والد کو گھر لے آیا تو ایان انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ وہ جلدی سے دادا جان کے پاس آیا، انہیں سلام کیا اور ان کے سینے سے لپٹ گیا۔ دادا جان نے بھی ایان کو بہت پیار

کیا۔ "پاپا! آئی ایم سوری لیکن میں آپ سے بُرا سلوک اس لیے کر رہا تھا تاکہ میں آپ کو آپ کی غلطی کا احساس دِلا سکوں۔ میں بھی دوسرے بچوں کی طرح اپنے دادا جان سے کھیلنا چاہتا تھا۔ شرارتیں کر کے ان کی ڈانٹ سننا چاہتا تھا، اس لیے میں نے یہ سب کیا۔" ایان اپنے پاپا سے کہہ رہا تھا۔

"ارے واہ! میرا بیٹا تو بہت سمجھ دار ہو گیا ہے۔" راشد نے کہا۔

"پاپا! آخر بیٹا کس کا ہوں۔" ایان نے کہا۔

اس کی اس بات پر سب مسکرا دیے۔

(دوسرا انعام: 100 روپے کی کتب)

دُم والا بچہ

(حافظ محمد عبداللہ منظور، سرگودھا)

کسی گھنے جنگل کے قریب چھوٹا سا ایک گاؤں تھا جس میں ٹنکو نامی ایک بچہ اپنے امی ابو کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کے ابو کھیتی باڑی کرتے تھے۔ ٹنکو اکثر ضد کر کے کھیت میں جاتا اور وہاں زمین دار کی بکریوں اور مرغیوں کے ساتھ کھیلتا تھا لیکن جانور ٹنکو کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ انہیں تنگ کرتا اور ان کی دُم کھینچتا جس سے انہیں تکلیف ہوتی تھی۔ ٹنکو کی امی اس کی شرارتوں سے بہت پریشان تھیں کہ بے زبان جانوروں کو تنگ کرنا بہت بُری بات ہے اور ایسا کرنے والے سے خدا بھی ناراض ہو جاتا ہے مگر ٹنکو پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ ایک دن ٹنکو نے جنگل میں لگے درختوں سے پھل توڑنے کا پروگرام بنایا۔ وہ ایک خوب صورت دن تھا۔ ٹنکو اچھلتا کودتا اور سیٹی بجاتا ہوا جنگل کی طرف چل دیا۔ ابھی وہ جنگل سے تھوڑے فاصلے پر تھا کہ اس کی نظر عجیب و غریب حلیے والے آدمی پر پڑی۔ لمبی ڈاڑھی اور سرخ رنگ کے لباس میں وہ کافی پُراسرار معلوم ہوا۔ اچانک وہ آدمی ایک سمت میں قدم بڑھانے لگا۔ ٹنکو نے اس کا تعاقب کرنا شروع کر دیا۔ کافی دُور چلنے کے بعد وہ ایک گلی میں مڑا جس میں کئی گھر بنے ہوئے تھے۔ یہ ٹنکو کے لیے بالکل نئی جگہ تھی۔ وہ آدمی ایک چھوٹے سے گھر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا اور ٹنکو اپنی جگہ رک گیا۔ اتنے میں اس کی نظر قریب ہی دیوار پر بیٹھی ہوئی ایک کالی بلی پر پڑی۔ بلی کی دُم لٹک رہی تھی۔ ٹنکو کو شرارت سوجھی اور اس نے بلی کی دُم پکڑ کر کھینچ لی۔ پھر ایک عجیب بات ہوئی کہ دُم اکھڑ کر ٹنکو کے ہاتھ میں آ گئی۔ بلی نے چیخ ماری اور میاؤں میاؤں کرتی اس آدمی کے گھر کے اندر بھاگ گئی۔ ٹنکو وہاں بلی کی دُم اپنے ہاتھ میں پکڑے کھڑا رہ گیا۔ وہ بلی کے یوں چیخنے سے ڈر گیا تھا۔ اچانک گھر کا دروازہ کھلا اور اندر سے وہی پُراسرار آدمی باہر نکلا اور چلّانے لگا۔ "تم ایک ظالم اور بے رحم لڑکے ہو۔ تم نے میری بلی کی دُم کھینچ لی۔" ٹنکو گھبرا گیا اور بولا۔ "میں یہ نہیں چاہتا تھا۔" اس نے پوچھا۔ "اب میں اس دُم کا کیا کروں؟" "تم اسے اپنے پاس رکھو۔" اس آدمی نے ٹنکو کے ہاتھ سے دُم چھین لی اور پھر اس کے منہ پر دے ماری لیکن ایک عجیب بات ہوئی، وہ دُم نہ جانے کیسے ٹنکو کی پشت پر جا کر چپک گئی اور ٹنکو دُم والا انسان بن گیا۔ ٹنکو یہ دیکھ کر بھاگا اور ایک جگہ رُک کر دُم کو زور سے کھینچا، مگر وہ اس کے جسم سے الگ نہیں ہوئی البتہ اسے شدید تکلیف ہوئی۔ اب وہ اپنے گھر کی جانب روانہ ہوا۔ کالی دُم اس کے پیچھے لہرا رہی تھی۔ آخر کار وہ اپنے گھر پہنچ گیا۔ وہ اپنی امی سے لپٹ کر رونے لگا اور انہیں سب کچھ بتا دیا۔ امی نے کہا۔ "میں نے تمہیں بہت سمجھایا تھا کہ بے زبان جانوروں اور پرندوں کو مت تنگ کرو۔ اب اس کا نتیجہ بھگتو۔" اس کے بعد ٹنکو نے جانوروں کو تنگ کرنا چھوڑ دیا لیکن اب گاؤں کے سب لوگ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ بچے تو اس کے گھر سے نکلنے کا انتظار کرتے تاکہ اس کی دُم کھینچ سکیں۔ اس دُم کے ساتھ چلنا پھرنا بھی ایک عذاب تھا۔ ٹنکو کوشش کرتا کہ دُم کا ایک سرا جیب کے اندر رکھے مگر دُم وہاں نہیں ٹکتی تھی۔ وہ خود بخود باہر آ جاتی اور ہوا میں لہراتی رہتی۔ اب ٹنکو جان گیا تھا کہ سارے جانور اور پرندے کیوں اپنی دُم کھینچے جانے سے ڈرتے تھے۔ ٹنکو روز اپنے خدا کے حضور گڑگڑا کر اس دُم سے نجات پانے کی دُعا کرتا اور اپنے کیے کی معافی مانگتا تھا۔ "میں آئندہ کبھی یہ بُری حرکت نہیں کروں گا، میں کسی جانور کی دُم نہیں کھینچوں گا۔" وہ نیند میں مسلسل یہی بات دہرا رہا تھا۔ امی نے یہ سنا تو اسے آواز دی۔ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی دراصل تھوڑی دیر پہلے ہی ٹنکو کھیت میں اچھل کود کر کے گھر لوٹا تھا اور تھکن کی وجہ سے نیند آ گئی تھی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ صرف ایک خواب تھا۔ امی کے پوچھنے پر ٹنکو نے انہیں خواب سنایا اور وعدہ کیا کہ وہ کبھی جانوروں کو تنگ نہیں کرے گا۔

(تیسرا انعام: 80 روپے کی کتب)

☆......☆......☆

آئیے عہد کریں!

علینہ اور صبا بہت اچھی دوست تھیں۔ دونوں ایک ہی جماعت میں پڑھتی تھیں۔ کبھی کبھار ایک دوسرے کے گھر جا کر کھیلتیں اور خوب مزے سے وقت گزارتیں۔ صبا یوں تو ایک اچھی بچی تھی لیکن اس کی ایک بُری عادت یہ تھی کہ وہ دوسروں کی چیزیں بغیر اجازت کے لے لیا کرتی تھی۔ اس کی دوستوں اور ہم جماعتوں کو یہ بات بہت ناگوار گزرتی تھی۔

یونہی ایک دن صبا نے بغیر پوچھے علینہ کے بستے میں سے پنسل نکال لی۔ علینہ کو پتا چلا تو وہ بہت ناراض ہوئی اور چپ چاپ تختہ سیاہ کو دیکھنے لگی۔ استانی جی نے محسوس کیا کہ علینہ کچھ خاموش سی ہے وہ ان دونوں کے قریب آئیں اور پوچھا۔

''علینہ! آج اتنی خاموش کیوں بیٹھی ہو؟''

''مس جی! صبا نے پھر مجھ سے پوچھے بغیر میرے بستے میں یہ پنسل نکال لی ہے۔''

''صبا! آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اجازت کے بغیر کسی کی چیز نہیں استعمال کرتے۔ بہتر ہے کہ جس کی چیز ہو اس سے اجازت لے لی جائے اور چیز لینے کے بعد شکریہ بھی ادا کرنا چاہیے۔ اس سے ایثار اور ہمدردی کا جذبہ بڑھتا ہے اور لین دین کے معاملات بھی خوش اسلوبی سے طے ہوتے ہیں۔''

صبا بہت شرمندہ ہوئی۔ اس نے عہد کیا کہ وہ آئندہ اجازت لے کر کسی کی چیز استعمال کرے گی اور چیز دینے والے کو شکریے کے طور پر جزاک اللہ بھی کہے گی۔

شاباش

ان بچوں نے پچھلے شمارے میں عہد کیا ہے کہ وہ کھانے میں نقص یا ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کریں گے اور کھانے کے آداب کا خیال بھی رکھیں گے۔

رانا محمد شبیر عباس، لاہور۔ محمد حذیفہ، چکسواری آزاد کشمیر۔ ربیعہ توصیف، واربرٹن۔ محمد حنظلہ، ننجوال کینٹ۔ اسامہ ظفر راجہ، جہلم۔ سنیعہ جاوید، سیال کوٹ۔ شہزادی خدیجہ شفیق، لاہور۔ عبداللہ عارف، لاہور۔ عائشہ کریم، ملتان۔ عبداللہ شاہ، دریا خان۔ محمد عبداللہ نیازی، بھکر۔ محمد عبداللہ ہاشم، لاہور۔ انعم افتخار، کراچی۔ مناہل کرامت، میاں والی۔ صبیح الحسن، سیال کوٹ۔ انیق اسد، اسلام آباد۔ ماہ نور ارشد، گوجرہ۔ محمد مجید خان، بھکر۔ انیس الرحمٰن، گوجرانوالہ کینٹ۔ محمد بلال عباس، لاہور۔ ثمرہ طارق بٹ، گوجرانوالہ۔ حائقہ عزیز، ڈیرہ اسماعیل خان۔ امیمہ عروج، ملتان۔ انعم عابد، ملتان۔ ثمیرہ بٹ، ڈنگہ۔ ذیشان احمد صدیقی، کندیاں۔ ماہ رخ آمنہ، چیچہ وطنی۔ انیزہ مظفر، لاہور۔ عبدالمعید شفیق، لاہور۔ نور حسین قادری، کاموئکی۔ اشمل افضل، لاہور۔ حسالہ ندیم، کاموئکی۔ راجہ ثاقب محمود، پنڈ دادنخان۔ عتیق الرحمٰن، گجرات۔ ایمن سہیل جوئس، ایبٹ آباد۔ بختاور افضل، لاہور۔ حافظہ میمونہ بشیر، لاہور۔ حلیمہ نشان، کاموئکی۔ عبداللہ بن نعیم، جہلم۔ اسد علی انصاری، ملتان۔ محمد حماد نصیر، رحیم یار خان۔

پیارے بچو! اب تک آپ نے علامہ اقبال کے بارے میں بہت کچھ جان لیا لیکن اقبال کی شخصیت ایسی دل آویز ہے کہ محض چند صفحات میں ان کی پوری تو کیا تھوڑی سی سیرت پر بھی روشنی نہیں پڑ سکتی۔

ہمارے اقبال...... ہمارے قومی شاعر ایک مفکر اور فلسفی شاعر کے مزاج میں شگفتگی، رحمدلی اور ایسی ہی کئی اور صفات بھی تھیں۔ ان کی محفل ہر ایک کے لیے عام تھی۔ طالب علم، استاد، جج بڑے سے بڑے افسر حتیٰ کہ ہندوستان سے باہر کے لوگ بھی بڑے ذوق وشوق سے ان کی محفل میں آ کر بیٹھتے۔ اقبال سے فیض اٹھاتے اور پھر واپس چلے جاتے۔ یوں جو بھی چاہتا علامہ سے بڑی آسانی سے ملاقات کر لیتا...... جب کہ آج کل کسی چھوٹے سے وزیر مشیر کو بھی ملنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ سچ ہے عظیم لوگوں کی عظیم باتیں...... عظیم کردار ہوتا ہے۔ آیئے اب علامہ اقبال کی شخصیت کے کچھ خوب صورت گوشوں پر نظر ڈالتے ہیں۔

سادگی

علامہ کی زندگی سادگی کا مکمل نمونہ تھی۔ باوجود اس کے کہ بڑے بڑے افسران و حکام اور ارباب علم وفن آپ کے پاس آتے رہتے تھے، پھر بھی آپ کے یہاں کوئی ساز و سامان اور شان و شوکت نہ تھی۔ عموماً نواڑ کی چارپائی پر تکیہ لگائے لیٹے ہوئے حقہ پیتے رہتے تھے۔ اکثر جسم پر صرف بنیان اور تہبند ہوتا تھا اور اسی طرح مغرب و مشرق کے فضلاء، حکما و امرا سے ملاقات کرتے تھے۔ آپ کے پاس جانا بے حد آسان تھا۔ نہ دروازہ پر کوئی دربان تھا اور نہ کسی تعین وقت کی ضرورت ہوتی تھی۔ ہر شخص آزادی سے جب چاہے آپ کے حضور میں باریاب ہو سکتا تھا۔ کسی سے ملتے وقت کبھی تو چارپائی پر دو زانو ہو کر بیٹھ جاتے اور کبھی تکیہ کے سہارے کروٹ سے لیٹے لیٹے گفتگو کرتے رہتے۔

مرزا جلال الدین صاحب بیرسٹر لکھتے ہیں:
''معاشرتی بحثوں میں وہ ہمیشہ سادہ زندگی اختیار کرنے کی تلقین فرمایا کرتے بلکہ حضور رسالت مآب ﷺ کی سادہ زندگی کو اپنا اسلوب بنانا چاہتے۔ جب وہ میری درخواست پر انارکلی سے میکلوڈ روڈ پر اٹھ آئے تو ان سے مکان کی آرائش کے لیے کہا کہ وہ اس کے مردانہ کمروں کو ڈرائنگ اور ڈائننگ کی صورت میں تقسیم کر دیں مگر اس پر انھوں نے یہی فرمایا کہ وہ کسی قسم کے بے معنی تکلفات میں الجھنا نہیں چاہتے۔ چنانچہ کوٹھی میں رہائش اختیار کرنے کے باوجود انھوں نے اپنا معاشرتی اسلوب وہی رکھا جو انارکلی کے بازار کے قیام کے دوران میں تھا۔''

ذیل کا واقعہ آپ کی سادگی کے تصور پر نمایاں روشنی ڈالتا ہے۔ مولانا مودودیؒ صاحب لکھتے ہیں: ''پنجاب کے ایک دولت مند رئیس نے ایک قانونی مشورہ کے لیے اقبال اور سر فضل حسین مرحوم اور ایک دو اور مشہور قانون دان صاحب کو اپنے ہاں بلایا اور اپنی شان دار کوٹھی میں ان کے قیام کا انتظام کیا۔ رات کو جس وقت اقبال اپنے کمرے میں آرام کرنے کے لیے گئے تو ہر طرف عیش و تنعم کے سامان دیکھ کر اور اپنے نیچے نہایت نرم اور قیمتی بستر پا کر معاً ان کے دل میں یہ خیال آیا کہ جس رسول پاک ﷺ کی جوتیوں کی

صدقے میں آج ہم کو یہ مرتبے نصیب ہوئے ہیں انھوں نے بوریے پر سوسو کر زندگی گزاری تھی۔ یہ خیال آنا تھا کہ آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی۔ اس بستر پر لیٹنا ان کے لیے ناممکن ہو گیا۔ اٹھے اور برابر کے غسل خانے میں جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور مسلسل رونا شروع کر دیا۔ جب ذرا دل کو قرار آیا تو اپنے ملازم کو بلا کر اپنا بستر کھلوایا، اور ایک چار پائی اس غسل خانہ میں بچھوائی اور جب تک وہاں مقیم رہے، غسل خانے ہی میں سوتے رہے۔

انکسار

جس شخص میں اس قدر سادگی ہو، وہ کیا کچھ منکسر المزاج نہ ہوگا۔ علامہ کی بے مثل شخصیت پر نظر ڈالیے اور پھر اس خط کو دیکھیے جو مرحوم نے ''اقبال ملٹری اسکول'' قائم کرنے کی تجویز کے جواب میں ارسال کیا تھا اور جسے مسلم لائبریری خورجہ کے تعزیتی جلسے میں اقبال محمد خاں صاحب نے جو میجر سعید محمد خاں صاحب رئیس جمال پور کے صاحبزادہ ہیں، پڑھ کر سنایا۔ لکھا تھا:

محترمی میجر صاحب!

ایک معمولی شاعر کے نام سے فوجی اسکول کو موسوم کرنا کچھ زیادہ موزوں معلوم نہیں ہوتا۔ میں تجویز کرتا ہوں کہ آپ اس فوجی اسکول کا نام ''ٹیپو فوجی اسکول'' رکھیں۔

ٹیپو ہندوستان کا آخری مسلمان سپاہی تھا جس کو ہندوستان کے مسلمانوں نے اس قدر جلد فراموش کر دینے میں بڑی ناانصافی سے کام لیا ہے۔ جنوبی ہندوستان میں جیسا کہ میں نے خود مشاہدہ کیا ہے، اس عالی مرتبت مسلمان سپاہی کی قبر زیادہ زندگی رکھتی ہے۔ بہ نسبت ہم جیسے لوگوں کے جو بظاہر زندہ ہیں یا اپنے آپ کو زندہ ظاہر کر کے لوگوں کو دھوکا دیتے رہتے ہیں۔ نیاز مند محمد اقبال

قناعت

علامہ مغفور کو اپنی ذات کے لیے کسی شے کی ضرورت نہ تھی۔ بے نیازی، قناعت اور توکل آپ کا خاصہ تھا۔ باوجودیکہ آپ کے مزاج میں نفاست پسندی بدرجہ اتم موجود تھی اور لطیف و خوش غذائیں مرغوب تھیں مگر آپ کے ملازم خاص علی بخش کا بیان ہے کہ ''اب تو میں خدا کے فضل سے اچھا خاصا باورچی ہوں لیکن اس زمانہ میں مجھے کچھ واجبی ہی کھانا پکانا آتا تھا۔ پھر بھی جیسا کچھ پکا ریندھ کر سامنے لا رکھتا، ڈاکٹر صاحب صبر و شکر کر کے کھا لیتے تھے۔''

ایک زمانے میں اکثر احباب کی کوشش تھی کہ حضرت علامہ کو قلمرو آصفیہ میں کوئی مناسب عہدہ مل جائے۔ آپ خود بھی حیدر آباد جانا چاہتے تھے مگر قناعت اور خودداری کا یہ عالم تھا کہ اس مقصد کے حصول کے لیے تگ و دو نہ کی۔ ۱۸ مارچ ۱۹۱۷ء کو مہاراجا سرکشن پرشاد کو لکھتے ہیں:

''میں نے اب تک اپنے معاملات میں ذاتی کوشش کو بہت کم دخل دیا ہے۔ ہمیشہ اپنے آپ کو حالات کے اوپر چھوڑ دیا ہے، اور نتیجہ سے خواہ وہ کسی قسم کا ہو، خدا کے فضل و کرم سے نہیں گھبرایا۔ اس وقت بھی قلب کی کیفیت یہی ہے کہ جہاں اس کی رضا لے جائے گی جاؤں گا۔ دل میں یہ ضرور ہے کہ اگر خدا کی نگاہِ انتخاب نے مجھے حیدر آباد کے لیے چنا تو اتفاق سے یہ انتخاب میری مرضی کے بھی عین مطابق ہے۔ گویا بالفاظ دیگر بندہ و دیگر آقا کی رضا اس معاملے میں کلی طور پر ایک ہے۔''

سر راس مسعود مرحوم کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں۔ بہترین مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے۔ ضرورت سے زیادہ کی ہوس کرنا، روپیہ کا لالچ ہے جو کسی طرح بھی کسی مسلمان کے شایانِ شان نہیں ہے۔ آپ کو میرے اس خط سے یقیناً کوئی تعجب نہ ہوگا کیوں کہ جن بزرگوں کی آپ اولاد ہیں، اور ہم سب کے لیے زندگی کا نمونہ ہیں، ان کا شیوہ ہمیشہ سادگی اور قناعت رہا ہے۔''

شعر کیسے کہتے

علامہ کی شعر گوئی واردات و تاثرات کے تحت آتی ہے۔ کبھی آپ ایک ہی دن میں سیکڑوں شعر کہہ لیتے تھے، اور کبھی ہفتوں بلکہ مہینوں کچھ کہنے کا اتفاق نہ ہوتا تھا۔ ایسا ہوا کرتا تھا کہ رات میں آنکھ کھل گئی اور شعر از خود پیدا ہونے لگے لیکن صبح ہوتے ہی ذہن سے اتر جاتے تھے۔ اس لیے علامہ کا معمول ہو گیا تھا کہ آپ تکیے

کے نیچے پنسل کاغذ رکھ کر لیٹتے تھے۔ اگر رات میں اشعار فرماتے تو ہر شعر کے ابتدائی چند لفظ کاغذ پر لکھ لیتے اور صبح کو ان اشارات کی مدد سے تمام اشعار نقل کر کے ایک جگہ ترتیب دے لیتے۔ ان کے شعر کہنے کی حالت بھی دوسرے شعرا سے الگ تھی۔ فرماتے تھے کہ:

''سال میں چار پانچ ماہ تک ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھ میں ایک خاص قوت پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے بلا ارادہ شعر کہتا رہتا ہوں۔ اس قوت کے ہوتے ہوئے گھر میں دوسرے کام بھی کرتا رہتا ہوں مگر زیادہ تر طبیعت کا رجحان شعر گوئی کی طرف ہوتا ہے۔ ان دنوں عموماً رات کو شعر گوئی کے لیے بیدار رہنا پڑتا ہے۔''

میرے استفسار کرنے پر فرمایا کہ:

''میں نے زیادہ سے زیادہ ایک رات میں تین سو اشعار کہے ہیں۔ چار پانچ ماہ کے بعد یہ قوت ختم ہو جاتی ہے تو غور و فکر کے بعد کچھ شعر کہے جا سکتے ہیں مگر یہ آورد ہوتی ہے اور وہ آمد۔ دونوں طرح کے کہے اشعار میں تمیز کی جا سکتی ہے۔''

حکیم صاحب لکھتے ہیں کہ: ''ان کو اس وقت بے حد تکلیف ہوتی تھی جب کوئی ان سے دوسرے شاعروں کی طرح اشعار سنانے کی فرمائش کرتا تھا۔''

آپ کیسے شاعر ہیں؟

اب ایک واقعہ اقبال کے نہایت قریبی دوست نواب سر ذوالفقار علی خاں کے صاحبزادے نواب زادہ خورشید علی خاں کی زبانی سنیے۔ وہ کہتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب ہمارے ہاں روزانہ آیا کرتے تھے، ہماری کوٹھی ''زرفشاں'' کی گراؤنڈ میں یوکلپٹس کے بہت سارے درخت تھے اور ان سے گوند نکلا کرتی تھی۔ میں ان درختوں سے گوند کھرچ کھرچ کر روزانہ ڈبوں میں بھرا کرتا تھا۔ میری عمر اس وقت دس سال ہو گی۔ ڈاکٹر صاحب ہماری موٹر میں تشریف لاتے تھے۔ جمیل سنگھ ہمارے ڈرائیور کا نام تھا۔ ڈاکٹر صاحب موٹر سے اترتے ہی پوچھتے کہ: ''چھوٹے میاں! کیا کر رہے ہو؟'' میں جواباً کہتا: ''گوند نکال رہا ہوں۔''

تو وہ کہتے: چھوٹے میاں نے گوند نکالی درخت سے

تو میں کہتا کہ بس آپ کی شاعری ختم ہو گئی؟ فرماتے کہ ''ابھی تو ایک ہی مصرع ہوا ہے۔'' روزانہ یہی کیفیت رہتی۔ میں کہتا کہ ''آپ کیسے شاعر ہیں کہ دوسرا مصرع نہیں لگا سکتے۔'' ایک دن تشریف لائے تو کہنے لگے، چھوٹے میاں! آج ہم نے دوسرا مصرع بھی کہہ لیا ہے۔ سنو:

چھوٹے میاں نے گوند نکالی درخت سے
اور ہو گی ان کی شادی کسی نیک بخت سے

علامہ اقبال کا آٹوگراف

بھئی، ایک اہم بات تو آپ کو بتانا ہم بھول ہی گئے۔ علامہ اقبال جب بھی کہیں اپنا نام تحریر کرتے ہمیشہ محمد اقبال لکھتے۔ ان کے جتنے بھی خطوط ہم نے اقبالیات کی کتابوں میں پڑھے ہیں، نیچے محمد اقبال لکھا ہے جب کہ انگریز کے دور میں کافی لوگ محمد کی جگہ ایم لکھا کرتے تھے۔ عمر کے آخری دور میں ہمارے اقبال کا دل اتنا ملائم، اتنا حب رسولؐ میں سرشار رہتا تھا کہ حضور رسالت مآب خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ کا نام نامی زبان پر لاتے ہی ان کی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں...... قرآن سے ان کی محبت بھی دیکھنے والی تھی۔ ہاں تو بات کرنی تھی آپ سے، ان کے ایک آٹوگراف کی۔

صغرا ہمایوں مرزا ایک ادیبہ اور شاعرہ خاتون تھیں۔ ان کا علمی اور ادبی مقام حیدر آباد دکن کی خواتین میں بہت نمایاں تھا۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ علامہ اقبال سے اپنی ملاقات کا حال یوں سناتی ہے:

''1928ء میں جب ہم کشمیر گئے تو راستہ میں چند دن لاہور ٹھہرنا پڑا۔ میرے میاں بیرسٹر صاحب، سر محمد اقبال سے ملنے گئے۔ اس کے بعد ان کی بیگم صاحبہ نے موٹر بھیج کر مجھے بلوایا۔ میں نے ایک نظم نور جہاں کے مزار پر پیش کرنے کے لیے لکھی تھی، وہ سر محمد اقبال کو دکھائی۔ اس میں انھوں نے اصلاح دی۔ اس طرح وہ میرے استاد بھی ہوئے۔ میری آٹوگراف البم میں سر محمد اقبال صاحب نے انگریزی میں ایک جملہ لکھا جس کا اردو ترجمہ درج کرتی ہوں:

''اسلام کی تعریف میں چند الفاظ میں ظاہر کرتا ہوں یعنی ذاتِ باری پر پورا بھروسا ہے اور میں موت سے مطلق نہیں ڈرتا۔''

محمد اقبال

لاہور، 11 جولائی 1928ء

☆......☆......☆

مدیرِ تعلیم و تربیت! السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

اکتوبر کا شمارہ سپرہٹ تھا۔ کہانیاں ایک سے بڑھ کے تھیں۔ پڑھ کے بہت مزا آیا۔ یہ میرا پہلا خط ہے۔

(محمد اسامہ وحید، ہری پور)

اکتوبر کا شمارہ زبردست تھا۔ کیا ہم کوئی اسلامی واقعہ بھیج سکتے ہیں؟

(نجیب، لاہور)

☆ جی ہاں! بھیج سکتے ہیں۔

میں نے تین ماہ سے تعلیم و تربیت پڑھنا شروع کیا ہے۔ میرا رزلٹ آ رہا ہے۔ دُعا کریں۔ (عروبہ ملک، لاہور)

☆ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

اکتوبر کا شمارہ زبردست تھا۔ میں 2 سال سے پڑھ رہا ہوں۔ خط پہلی بار لکھ رہا ہوں۔ کہانی بھیج رہا ہوں، ضرور شائع کریں۔

(حسنین شفیق، ٹیکسلا)

میں چہارم جماعت کی طالبہ ہوں۔ 5 مہینوں سے تعلیم و تربیت پڑھ رہی ہوں۔ ہر ماہ رسالے کا انتظار رہتا ہے۔

(عائشہ خالق، لاہور)

اکتوبر کا شمارہ زبردست تھا۔ ایمان دار تتلی اور محاورہ کہانی پسند آئی۔ یہ میرا دوسرا خط ہے۔ ضرور شائع کیجئے گا۔ (ماہ رخ آمنہ)

اکتوبر کا شمارہ لاجواب تھا۔ تمام کہانیاں ٹاپ پر تھیں۔ میں آپ کا نیا قاری ہوں۔ (حافظ عبدالشکور قاسمی، چکسواری)

☆ آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔

ڈیئر ایڈیٹر! آپ نے میرا پہلا خط شائع نہیں کیا۔ میرا انعامی سلسلوں میں نام نہیں آتا۔ میں آپ سے ناراض ہوں۔

(سید حسن عسکری)

☆ ڈیئر حسن! ناراض مت ہوں۔ قرعہ اندازی کے ذریعے انعامات نکالے جاتے ہیں۔ بس انتظار کی زحمت اٹھانا پڑے گی۔

میں ہفتم جماعت کی طالبہ ہوں۔ پہلی بار خط لکھ رہی ہوں۔ تعلیم و تربیت ہر لحاظ سے ایک اچھا رسالہ ہے۔ نیلی روشنی کا راز، پیارے اللہ کے پیارے نام اور سائنس کارنر پسند آیا۔

(مریم سلیمان بٹ، گوجرانوالہ)

☆ ڈیئر مریم! آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ یہ آپ کا اپنا رسالہ ہے۔ تحریریں اور تجاویز بھی بھیجیں۔

میرے تمام قارئین بہن بھائیوں کو سلام۔ تعلیم و تربیت صحیح معنوں میں نئی نسل کی اعلیٰ تربیت کر رہا ہے۔ مختصر مختصر، سنہرے لوگ اور معلوماتِ عامہ پسند آئیں۔ اقراء بشیر کی معلومات قابلِ تعریف تھیں۔ عائشہ کریم کو انعام جیتنے پر مبارک باد اور دُعائیں۔

(سنبل ماہین فاطمہ، سرگودھا)

میں کافی عرصے سے تعلیم و تربیت پڑھ رہا ہوں۔ پہلی بار شرکت کر رہا ہوں۔ رسالہ بہترین جا رہا ہے مگر پرانے رائٹرز کی تحریریں نہیں ہیں۔ مثلاً علی اکمل تصور، اور نذیر انبالوی۔ شکاریات کے موضوع پر بھی کچھ لکھیں۔ (ثانیہ طلعت، سیال کوٹ)

☆ ڈیئر ثانیہ! آپ کا تفصیلی خط پڑھا۔ آپ کی تجاویز پر غور کر رہے ہیں۔ نذیر انبالوی تعلیم و تربیت کی ادارت چھوڑ چکے ہیں۔ خط لکھنے کا شکریہ۔

مجھے تعلیم و تربیت پڑھتے ہوئے ایک سال ہو گیا ہے۔ اکتوبر کا شمارہ زبردست تھا۔ نیلی روشنی کا راز بہت ہی اچھا ناول ہے۔

(فہد مصطفیٰ، جام پور)

ہر مہینے کی طرح اکتوبر کا شمارہ لاجواب تھا۔ اس مہینے میری سال گرہ ہے۔ میری کہانی بھی شائع کیجئے گا۔ (محمد رافع، لاہور)

☆ سال گرہ مبارک ہو۔

اکتوبر کا شمارہ زبردست تھا۔ تمام کہانیاں زبردست تھیں۔ میں تعلیم و تربیت کا حصہ بننا چاہتا ہوں۔ (محمد جنید ناگرہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ)

☆ تعلیم و تربیت کا حصہ بننے کے لیے تمام سلسلوں میں حصہ لیجیے اور اپنی تحریریں بھی بھیجیں۔

میں دس سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہا ہوں۔ ہر مضمون ایک سے بڑھ کر ایک ہوتا ہے۔ ہمارے گھر میں بھی ذوق و شوق سے پڑھتے

ہیں۔ (عبدالجبار رومی انصاری، لاہور)

☆ بہت خوشی کی بات ہے۔ اپنی تحریریں اور تجاویز بھی بھیجیں۔

اس دفعہ کا شمارہ ہمیشہ کی طرح شان دار تھا۔ غلاف کعبہ کا مضمون انتہائی نادر معلومات لیے ہوئے تھا۔ یہ پہلا خط ہے۔ ساری ٹیم کو سلام۔ (زین خان، سرگودھا)

اچھی ایڈیٹر صاحبہ! کیسی ہیں۔ میں کافی عرصے سے تعلیم و تربیت پڑھ رہا ہوں کافی دل چسپ ہے۔ میں تعلیم و تربیت کا ممبر بننا چاہتا ہوں۔ (محمد راحیل بابر، لاہور)

☆ ڈیئر راحیل! تعلیم و تربیت کا ممبر بننے کے لیے 500 روپے کا منی آرڈر سرکولیشن مینیجر کے نام بھیج دیں۔

میں تین سال سے یہ رسالہ پڑھ رہا ہوں۔ میری کہانی کے متعلق بتا دیں کہ قابل اشاعت ہے یا نہیں۔ (محمد عمیر سلیم، ساہی وال)

☆ ڈیئر محمد عمیر! آپ کی کہانی پڑھ کر آپ کو مطلع کر دیا جائے گا۔

میں نے پہلی مرتبہ خط لکھا ہے۔ میں تین سال سے یہ رسالہ پڑھ رہا ہوں۔ اکتوبر کا شمارہ زبردست تھا۔ (شامیر بٹ، دینہ)

اکتوبر کے شمارے کی تمام کہانیاں سپرہٹ تھیں۔ اس ماہ میرے ایئرفورس کے امتحان ہیں۔ دُعا کیجیے گا۔ (محمد فرحان، واہ کینٹ)

☆ اللہ تعالیٰ آپ کو اچھے نمبروں سے پاس کرے۔ دین اور ملک و قوم کے لیے فائدہ مند بنائے۔ آمین!

میں نے پہلی مرتبہ خط لکھا ہے۔ مجھے خوش آمدید کہیں ورنہ میں اس رسالے سے مایوس ہوں۔ (صبیح الحسن آف سندھوالہ، سیال کوٹ)

☆ آپ کی پیار بھری دھمکی کے جواب میں آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں بہت سی دُعاؤں کے ساتھ۔

اکتوبر کا شمارہ ہمیشہ کی طرح لاجواب تھا۔ میرے امتحان ہو رہے ہیں۔ یہ میرا پہلا خط ہے۔ (عمیمہ عروج، ملتان)

تعلیم و تربیت بہت اچھا رسالہ ہے۔ اس میں اچھی اچھی اور سبق آموز کہانیاں ہوتی ہیں۔ یہ میرا پہلا خط ہے۔

(زم زم محسن علی، نوشہرہ)

میں تعلیم و تربیت بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ پہلی بار شرکت کر رہا ہوں۔ میری کاوش اچھی لگے تو ضرور شائع کیجیے گا۔

(عظیم ڈوگر، ملتان)

ستمبر میں آپ نے میرا خط شائع نہیں کیا۔ شیر بیٹی، مزہ نہیں آتا، بھائی کی پہلی تنخواہ بہت مزے کی کہانیاں تھیں۔ معلومات عامہ نے معلومات میں اضافہ کیا۔ لطیفوں نے خوب ہنسایا۔

(علینہ اظہر، اسلام آباد)

اکتوبر کے شمارے کی تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ بھیانک رات، نیلی روشنی کا راز، ایمان دار تتلی بہت پسند آئیں۔

(محمد حنظلہ، نجوال کینٹ)

ایڈیٹر صاحبہ! میں تعلیم و تربیت کا نیا قاری ہوں۔ مجھے لکھنے کا طریقہ نہیں آتا۔ امید ہے مجھے خوش آمدید کہیں گے۔

(عبدالمعید شفیق، لاہور)

☆ آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ آپ لکھیں اور ہمیں بھیجیں ہم آپ کی اصلاح کریں گے۔

میں نے تعلیم و تربیت میں پہلی بار خط لکھا ہے اکتوبر کا شمارہ بہت اچھا تھا۔ (ضحیٰ ظفر، گوجرانوالہ)

اکتوبر کا شمارہ زبردست ہے۔ اس سے بہت کچھ سیکھا۔ یہ میرا پہلا خط ہے۔ (طلحہ سمید، وہاڑی)

☆ صفا رشید کراچی سے اور شہزادی خدیجہ ہماری بہت پیاری سی قارئین ہیں۔ رسالے میں بھرپور حصہ لیتی ہیں۔ ان سب کا شکریہ۔

☆ محمد عمر عباس بھروانہ گھسیٹ پور اور فضا سکندر سرگودھا سے ان کی نومبر میں سال گرہ ہے۔ آپ کو بہت سی دُعاؤں کے ساتھ سال گرہ مبارک ہو۔

☆ لائبہ نور چکوال سے اور ماریا سہیل اٹک سے بہت رنگ برنگ اور خوب صورت خط لکھتی ہیں۔ آپ کی محبت اور دل چسپی کا شکریہ اور آپ کے لیے ڈھیروں پیار اور دعائیں۔

☆ پنڈ دادنخان سے راجہ ثاقب محمود جنجوعہ اور راجہ فرخ حیات جنجوعہ نے رسالے کو بہت پسند کیا ہے۔ ہمارے یہ اچھے سے قارئین باقاعدگی سے تحریریں بھیجتے ہیں اور تمام سلسلوں میں حصہ بھی لیتے ہیں۔ بہت خوشی کی بات ہے۔

☆ ماہ نور ارشد گوجرہ سے رسالے کو بہت پسند کرتی ہیں اور پہلی بار خط لکھ رہی ہیں۔ آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔

☆ مناہل افضل نے لاہور سے ہمیشہ کی طرح تفصیلی خط لکھا ہے اور بہت اچھا تبصرہ بھی کیا ہے۔

☆......☆......☆

سچّی لگن

ام عادل

احمد برلاس شہر کے ایک مشہور و معروف وکیل تھے۔ وہ اپنے کلائنٹ کے مقدمات بڑی محنت اور پیشہ وارانہ ایمان داری سے لڑتے تھے۔ اسی لیے رشوت کی لعنت سے دُور تھے۔ وہ اپنے مخالف فریق کو کبھی جھوٹ اور بے ایمانی سے نہیں بلکہ اپنی ذہانت اور سچے شواہد عدالت میں پیش کر کے زیر کرتے تھے۔ ان کی صرف دو ہی اولادیں، ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھیں۔ دو سال قبل وہ بیٹی کی شادی کر کے اس فرض سے سبکدوش ہو چکے تھے جب کہ بیٹا کینیڈا میں زیرِ تعلیم تھا جس کی تعلیم کا پورا نہ سہی، کچھ نہ کچھ خرچہ ضرور بھیجنا پڑتا تھا۔ پچھلے برس احمد برلاس کی بیوی رضائے الٰہی سے وفات پا گئیں تو ان کے خاندانی نوکر عبداللہ عرف عبدل نے انہیں سنبھالا دیا۔ عبدل اور احمد برلاس تقریباً ہم عمر تھے۔ وکیل صاحب کے والد محمد برلاس نے ان کے بچپن میں عبدل کے والد رحمان بابا کو اپنے ہاں نہ صرف ملازم رکھا بلکہ اپنے بڑے سے گھر کے سرونٹ کوارٹر میں باپ بیٹے کو رہنے کی جگہ بھی دی۔ رحمان بابا محمد برلاس کی اس مہربانی پر تاحیات مشکور رہے اور آخر دم تک نہ صرف خود اس خاندان کی خدمت کی بلکہ اپنے بیٹے عبدل کو بھی اس گھر کے مکینوں کی خدمت کرنے اور وفادار رہنے کی تربیت دی۔ احمد برلاس اور عبدل جو اب احمد برلاس کے بچوں کے عبدل چاچا بن چکے تھے، ان کا بچپن اکٹھے کھیل کود کر گزرا۔ احمد برلاس کی شادی کے فوراً بعد محمد برلاس نے ایک غریب مگر عزت دار گھرانے میں عبدل کی شادی بھی کروا دی۔ قدرت نے احمد برلاس کو تو اولاد سے نوازا مگر چاچا عبدل کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی۔ عبدل چاچا نے کبھی خدا سے شکوہ نہ کیا اور اپنی بے اولادی کو خدا کی کوئی مصلحت جان کر صابر رہے۔ عبدل چاچا اور ان کی بیوی احمد برلاس کے بچوں کو اپنے حقیقی بچوں جیسی محبت دیتے۔ پانچ سال قبل عبدل چاچا کی بیوی رضیہ بھی انہیں تنہا چھوڑ کر ابدی سفر پر روانہ ہو گئیں۔ اس مشکل اور تنہا وقت میں گھر کے تمام مکینوں نے اس کڑے وقت انہیں بہت سنبھالا دیا۔ وکیل صاحب کے بیٹے خرم نے اب عبدل چاچا کو اپنے کمرے میں سلانا شروع کر دیا۔ عبدل چاچا اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے بچپن ہی سے نماز روزے کے پابند تھے۔ بیوی کی وفات کے بعد انہوں نے مزید اللہ سے لو لگائی۔ خرم کی جب آنکھ کھلتی، عبدل چاچا نوافل اور تہجد میں مصروف ہوتے۔ اب تو اٹھتے بیٹھتے ان کی صرف ایک ہی تمنا تھی کہ مرنے سے قبل خدا انہیں اپنے گھر اور روضۂ رسول کی زیارت کرا دے۔ احمد برلاس عبدل چاچا کی اس خواہش اور شدت سے آگاہ تھے مگر مجبور تھے۔ ان کے اتنے وسائل نہ تھے۔ پھر ایک دن اچانک احمد برلاس کو

صوبے کی ایک بہت بڑی سماجی اور سیاسی شخصیت چوہدری قادر سندھی کا فون آیا۔ چوہدری صاحب نے احمد برلاس سے درخواست کی کہ آپ سے ایک بہت ہی ضروری کام آن پڑا ہے۔ مہربانی کر کے آج ہی ہمارے گاؤں ہمارے غریب خانے پر تشریف لائیں۔

''جی چوہدری صاحب! میں آج ہی حاضر ہو جاتا ہوں۔'' کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔ وکیل صاحب جانے کی تیاری کے ساتھ سوچ رہے تھے کہ چوہدری صاحب کو یقیناً کسی مقدمے کے سلسلے میں میری خدمات درکار ہوں گی۔ چوہدری قادر سندھی، سندھ کی ایک نامور شخصیت تھے۔ ان کی ذات تو کچھ اور تھی مگر انہیں اپنی سندھی دھرتی سے اتنا پیار تھا کہ اپنے نام کے ساتھ سندھی لکھنا اور پکارا جانا پسند کرتے تھے۔ تین گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد احمد برلاس جب چوہدری قادر کی حویلی پہنچے تو حویلی کے مین گیٹ پر انہیں منتظر پایا اور عزت کے ساتھ وکیل صاحب کو اپنی اوطاق میں لے گئے۔

وکیل صاحب کی بھرپور مہمان نوازی کے بعد چوہدری صاحب گویا ہوئے۔ ''وکیل صاحب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ہم نے آپ کو کسی مقدمے یا قانونی مسئلے کے حل کے لیے زحمت دی ہے مگر ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ہم نے تو آپ کو ایک خدائی حکم کی تعمیل کے لیے زحمت دی ہے۔'' احمد برلاس نے چوہدری صاحب کی مبہم گفتگو سے چونک کر ان کی طرف دیکھا، چوہدری صاحب کے چہرے پر ایک نور اور خوشی پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ لمحے کے بعد چوہدری قادر پھر گویا ہوئے۔ ''وکیل صاحب سب سے پہلے یہ بتایئے کہ آپ کے ہاں عبدل نام کا کوئی ملازم ہے؟'' ''جی جی چوہدری صاحب! میرے ہاں صرف ایک ہی ملازم ہے جس کا نام عبدل ہے مگر آپ اسے کیسے جانتے ہیں؟'' وکیل صاحب حیرت سے سوچ رہے تھے کہ مجھے تو میری شہرت اور پیشے کی وجہ سے چوہدری صاحب کا جاننا کوئی تعجب کی بات نہیں مگر بے چارے سیدھے سادے عبدل کو چوہدری صاحب کیسے جانتے ہیں جب کہ عبدل تو سوائے نزدیکی مارکیٹ سے سودا سلف لانے کے علاوہ کبھی کہیں گیا ہی نہیں۔ ''وکیل صاحب آپ کا حیران ہونا بجا ہے۔'' چوہدری صاحب نے وکیل صاحب کی حیران کن کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ''جب آپ میری پوری بات سنیں گے تو آپ خود بخود جان جائیں گے کہ میں آپ کے گھریلو ملازم عبدل کو کیسے جانتا ہوں۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ گزشتہ کئی راتوں سے مسلسل خواب میں مجھے ایک غیبی آواز سے ہدایات مل رہی ہیں کہ شہر کے مشہور وکیل احمد برلاس کے ہاں ایک ملازم عبدل ہمارے گھر حاضری دینے کے لیے بے قرار ہے۔ تم اس کے سفر کے انتظامات کرو۔ تسلسل سے آنے والا خواب بے معنی نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں مَیں نے علماء کرام سے جب رابطہ کیا تو انہوں نے یہی حل بتایا کہ آپ سے رابطہ کر کے خواب میں ملنے والی ہدایت کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ آپ کا نام اور کام تو نیوز چینلز پر دیکھتا اور سنتا رہتا ہوں۔ آپ کا نمبر بھی ایک نیوز پیپر سے حاصل کیا ہے۔ اب آپ مجھے اپنے ملازم عبدل کے بارے میں بتایئے وہ کیسا بندہ ہے؟'' چوہدری صاحب وکیل صاحب کو بلوانے کا مقصد تفصیلاً بتا کر کے اور عبدل کے متعلق جاننے کے لیے جواب طلب نظروں سے احمد برلاس کی طرف دیکھنے لگے۔ ''چوہدری صاحب! سبحان اللہ، اللہ بڑا بے نیاز اور کارساز ہے۔ جب اس کے بندے کی طلب سچی اور دعاؤں میں تڑپ ہو تو وہ ضرور انہیں سنتا اور قبول کرتا ہے اور ان کی تکمیل کا ذریعہ خواہ کسی کو بھی بنا دے۔ عبدل ایک شریف، نمازی، پرہیزگار، میرا ہم عمر اور ایک سچا مسلمان ہے۔ بچپن سے ہمارے ساتھ ہے۔ ہم اسے گھریلو ملازم نہیں، فیملی کا فرد سمجھتے ہیں۔ اس کی کوئی اولاد نہیں۔ بیوی پانچ سال قبل وفات پا چکی ہے۔ اب اسے صرف دو ہی کام ہیں، میری خدمت اور خدا کی عبادت۔ بے چارہ دبے لفظوں میں مجھ سے کئی بار حج ادا کرنے کی خواہش کا اظہار کر چکا ہے مگر کوشش کے باوجود میرے وسائل نہیں بن پا رہے کہ میں اس کی یہ تمنا پوری کر سکوں۔'' وکیل صاحب نے خوشی سے بھرپور آواز میں چوہدری صاحب کو عبدل کے متعلق بتایا۔

''ٹھیک ہے، وکیل صاحب اللہ نے عبدل کی دلی آرزو پوری کرنے کے لیے میرا انتخاب کیا ہے۔ مہربانی ہے مالک کی، یہ لیجیے پانچ لاکھ کا چیک اور اس سال عبدل کے حج پر جانے کی تیاری کیجیے۔'' احمد برلاس، چوہدری صاحب کا شکریہ ادا کر کے اور اجازت لے کر جب اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئے تو ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اڑ کر گھر پہنچ جائیں اور عبدل کو خوش خبری سنائیں۔ عبدل نے جب اتنی بڑی خوش خبری سنی تو انہوں نے ساری رات سجدے میں سر رکھ کر گزار دی۔ صبح ہوتے ہی وہ اپنے پاسپورٹ اور ضروری کاغذات کی تیاری کے سلسلے میں وکیل صاحب کے ہمراہ روانہ ہو گئے۔

پاکستان کے نام ور مصور اور سنگ تراش محمد اسماعیل گل جی اپنے فن کی ایک منفرد مثال تھے۔ انہوں نے 25 اکتوبر 1926ء کو پشاور میں آنکھ کھولی۔ یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ جس شخص کو آگے چل کر مصوری میں نام کمانا تھا اس نے اپنی تعلیم انجینئرنگ کے شعبے میں مکمل کی۔ 1946ء میں علی گڑھ سے انجینئرنگ میں گریجویشن کرنے کے بعد وہ سول انجینئرنگ کے لیکچرار مقرر ہوئے۔

1947ء میں انہوں نے امریکہ کی کولمبیا یونی ورسٹی سے ایم ایس (ہائیڈرالکس)، 1948ء میں ہارورڈ یونی ورسٹی سے ایم ایس (میکانیات) میں کیا۔ کچھ عرصہ بیرون ممالک میں ملازمت کرنے کے بعد وہ پاکستان آئے اور بلوچستان میں ایگزیکٹو انجینئر مقرر ہوئے۔

1955ء میں انہیں اوٹاوہ (کینیڈا کا دارالحکومت) کے سفارت خانہ پاکستان میں افسر رابطہ مقرر کیا گیا۔ بحیثیت انجینئر وہ منگلا اور وارسک ڈیم کی تعمیر کے دوران بہ طور مشیر منسلک رہے۔ اسی دوران ان کے فن مصوری سے متعلق جوہر کھل کر سامنے آئے اور وارسک میں 1954ء میں پہلی بار ان کی تصاویر کی نمائش ہوئی۔

گل جی ایک سادہ طبیعت کے ملنسار انسان تھے۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے فن پر بھرپور توجہ دی جس کی وجہ سے وہ بامِ عروج تک پہنچے۔ عموماً مصور کے لیے کینوس اور برش بے حد لازمی ہوتے ہیں۔ پھر تخیل کے سہارے وہ برش سے کینوس (Canvas۔ روغنی تصاویر کے لیے خصوصی کپڑا) پر مختلف رنگ بکھیر کر شاہ کار تخلیق کرتا ہے۔ گل جی نے اس شعبے میں نئی راہ اپنائی۔ انہوں نے مصوری اور سنگ تراشی کے باہم وجود سے وہ شاہ کار تخلیق کیے جو دیکھنے والوں کو داد دینے پر مجبور کر دیتے تھے۔ انہوں نے اپنے فن کی بدولت پاکستان اور بیرونِ پاکستان بے حد داد اور شہرت حاصل کی۔

گل جی نے کئی مشاہیر عالم کے پورٹریٹ (Portrait۔ تصویری خاکہ) بھی بنائے ہیں۔ ان میں بانیٔ پاکستان حضرت قائداعظم محمد علی جناح، فیض احمد فیض (شاعر) پاکستان کے سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو، فرانس کے سابق صدر چارلس ڈیگال، امریکہ کے سابق صدور (صدر کی جمع) ریگن اور جارج بش، افغانستان کے سابق بادشاہ ظاہر شاہ، سعودی عرب کے شاہ فیصل مرحوم، ایران کے رضا شاہ پہلوی، پرنس کریم آغا خان اور ہنری کسنجر سمیت دیگر لوگ شامل ہیں۔

گل جی نے اہم اور بڑی عمارتوں پر میورل (Mural۔ دیوار پر بنائی ہوئی تصویر) بھی کندہ کیے ہیں۔ ان عمارات میں حبیب بینک پلازا (کراچی)، شاہ فیصل شہید اسپتال (ریاض، سعودی عرب)، شاہ خالد محل (سعودی عرب) ہاریر گروپ بلڈنگ (سان

فرانسسکو)، اسماعیلہ سنٹر (لندن)، نیشنل اسمبلی بلڈنگ (اسلام آباد) شاہ فیصل مسجد (اسلام آباد) کی محرابیں، ڈیفنس لائبریری (کراچی)، ڈیفنس کالج (اسلام آباد) اور سب سے بڑھ کر سات ٹن وزنی شاہ فیصل مسجد کے لیے تخلیق کیا ہوا پتھر کا تراشیدہ فن پارہ شامل ہیں۔

اسماعیل گل جی نے فروری 1974ء میں لاہور میں منعقد ہونے والی دوسری اسلامی سربراہی کانفرنس کا خوب صورت طغریٰ بھی بنایا۔ ان کی تصاویر کی نمائش پیرس (فرانس)، جنیوا (سوئٹزرلینڈ)، واشنگٹن (امریکا)، لندن (برطانیہ) تہران (ایران)، نیویارک (امریکا) اور ٹوکیو (جاپان) میں بھی ہو چکی ہیں۔

وہ مجسمہ ساز اور مصور ہونے کے ساتھ ساتھ ایک انتہائی دل کش خطاط بھی تھے۔ ان کی خطاطی اپنے طرز میں منفرد اور روحانیت سے بھرپور تھی۔ انہوں نے اپنی خطاطی میں رنگ، شیشے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور سونے چاندی کا استعمال کر کے اس فن کو نئی جدت دی۔ اسماعیل گل جی جہاں اپنی تصویروں میں بولتے تھے اور اپنے مجسموں میں روح ڈال دیتے تھے، وہیں اپنی خطاطی کے ذریعے لفظوں کے پیچ و تاب کو نمایاں کر کے انہیں نئے معنی اور مفاہیم پہنا دیتے تھے۔ انہوں نے لفظ ''اللہ'' کو نت نئے طرز سے یوں لکھا کہ اس لفظ کا ہر پیچ و خم خدائے جل شانہٗ کی کبریائی اور عظمت کے گن گاتا محسوس ہوتا ہے۔ اسمائے ربانی پر مبنی ان کی خطاطی کے فن پارے دیکھنے والوں پر ایک وجد سا طاری کر دیتے ہیں۔

1974ء میں لاہور میں ہونے والی دوسری اسلامی سربراہی کانفرنس میں اسماعیل گل جی نے جو طغرے (خوش خط لکھا ہوا نمونہ) تخلیق کیے، وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ کانفرنس میں شریک کئی سربراہان مملکت و حکومت اور مندوبین (مندوب کی جمع، نمائندہ) ان فن پاروں کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ انہوں نے باقاعدہ کسی سے مصوری نہیں سیکھی بلکہ وہ خود اپنے استاد تھے۔ انہیں علی گڑھ یونی ورسٹی کی تاریخ کا سب سے کم عمر لیکچرار ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

ان کا سب سے بڑا کارنامہ شاہ فیصل مسجد اسلام آباد کا چاند، محراب اور منبر کی ڈیزائننگ ہے جو خطاطی، انجینئرنگ اور ماربل کے کام کا حسین امتزاج (ملانا۔ آمیزش) ہے۔ فیصل مسجد میں قرآن پاک کے کھلے اوراق کی شکل میں ماربل سے بنائی گئی محراب کو جوڑنے کے لیے ایک نایاب پتھر سے خط کوفی میں لفظ ''یا اللہ'' لکھا گیا ہے، جب کہ ماربل سے بنے اوراق پر تانبے کے الفاظ تراش کر خط کوفی میں ہی سورۃ رحمٰن رقم کی ہے۔ اس کے علاوہ مسجد کے گول منبر پر سورۃ فاتحہ لکھی ہوئی ہے۔ مسجد کے بلند دھاتی چاند پر سونے کا پترا چڑھا ہوا ہے۔ یہ کام 1986ء میں مکمل ہوا تھا۔ اسی دوران ان پر الزام لگا کہ سونے کے کام میں ملاوٹ کی گئی ہے۔ بعد میں الزام غلط ثابت ہوا مگر اس سے انہیں ذہنی کوفت بہت ہوئی۔ اسی کام کے دوران ان کی شادی کی پچیسویں سال گرہ آئی تو انہوں نے اپنی اہلیہ زریں گل کے ہمراہ سینکڑوں فٹ کی بلندی پر تعمیر مینار پر اس تقریب کو سادہ انداز میں منایا اور ایک دوسرے کو مبارک باد دی۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ سادہ دل انسان سے کسی کو کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ 19 دسمبر 2007ء کی صبح پتا چلا کسی نے انہیں ان کی بیگم کے ہمراہ قتل کر دیا ہے۔ انہیں تین دن قبل 16 دسمبر 2007ء کو قتل کیا گیا تھا۔ بعد میں قاتل پکڑا گیا جو گھر کا ملازم تھا۔

ڈھیلا ڈھالا لباس، سنتِ نبوی ﷺ اور جدید سائنس

1۔ ڈھیلا ڈھالا لباس پہننے سے پٹھوں (Muscles) کی افزائش پر مثبت اثر پڑتا ہے اور پٹھے چست رہتے ہیں۔

2۔ ڈھیلے ڈھالے لباس سے خون کا بہاؤ نارمل رہتا ہے اور خون اعضائے رئیسہ (Vital Organs) تک بغیر کسی دباؤ کے بآسانی فراہم ہوتا ہے جس سے دل، دماغ اور نظام ہاضمہ پر بہتر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

3۔ تنگ لباس ترک کرنے سے ذہنی اور اعصابی تناؤ میں کمی واقع ہوتی ہے جس کی وجہ سے اعصابی تناؤ اور کھنچاؤ جیسے امراض سے بچا جا سکتا ہے۔

4۔ ماہرین امراضِ معدہ اور جگر تنگ لباس کو ترک کرنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ تنگ لباس سے اعصابی تناؤ کی وجہ سے ایک کیمیائی مادہ (Gastrin) ہوتا ہے۔ جس سے معدے میں تیزابیت بڑھ جاتی ہے اور السر جیسے امراض پیدا ہوتے ہیں۔

دُنیا کے قدیم کھیلوں میں سے ایک اسکوائش بھی ہے۔ اس کھیل کی ابتداء ایک جیل خانے سے ہوئی۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے درمیان برطانیہ میں یہ رواج تھا کہ قرض کی ادائیگی نہ کرنے والوں کو سزا کے طور پر جیل میں بند کر دیا جاتا تھا۔ اس دور میں انگلستان میں ایسی جیلوں کی کوئی کمی تو نہ تھی لیکن ان میں ”فلیٹ پرزن“ جیل خانے کو غیر معمولی شہرت حاصل تھی۔ لندن کے فلیٹ جیل میں قیدی اکثر گیند کو دیوار سے مارتے دیکھے گئے جنھیں بعد میں ریکٹ سے گیند کو دیوار سے ٹکرانے کی تفریح کی باضابطہ اجازت دی گئی۔

آج کا مقبول کھیل اسکوائش قدیم کھیل ”ریکٹس“ کی تبدیل شدہ شکل ہے۔ ریکٹس کی ابتداء جیل خانے میں ہوئی جو آگے چل کر ریکٹس کے نام سے مشہور ہوا۔ اس سے متعلق ایک قابل بھروسا حوالہ انگریز مصنف چارلس ڈکنس کے شہرت یافتہ ناول پک وِک پیپرز (38-1837ء) میں ملتا ہے جس میں چارلس لکھتے ہیں کہ یہ کھیل اس زمانے میں بہت سے قیدیوں میں کھیلا جاتا تھا۔ ریکٹس کے پس منظر میں یہ بات بڑی تعجب خیز ہے کہ جس کھیل کی جڑیں قید خانے میں مضبوط ہوئیں اس کو شہرتِ دوام طالب علموں کے ذریعے نصیب ہوا۔ ریکٹس کا کھیل جیل سے درسگاہوں میں داخل ہوا، مگر کیسے؟ کہا جاتا ہے کہ اس کھیل کی ترقی میں ہارو (Harrow) اسکول انگلستان کے طلباء نے 1833ء میں دلچسپی لیتے ہوئے مستقل بنیادوں پر اسے اپنایا اور اسی اسکول میں ریکٹس کا سب سے پہلا کورٹ تعمیر کیا گیا۔ پہلا کورٹ نارتھ امریکہ سینٹ پال اسکول نیو ہمپشائر میں 1884ء میں، دوسرا فلاڈیلفیا میں، پھر اس کے بعد ریاست پنسلوانیہ میں 1904ء میں تعمیر کیا گیا۔ اس کھیل کی بڑھتی ہوئی مقبولیت نے ایک ادارہ بنانے کی طرف راغب کیا، یوں ”یونائیٹڈ اسٹیٹ اسکوائش ریکٹس ایسوسی ایشن“ کا قیام عمل میں آیا جسے آج ہم یو ایس اسکوائش کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ ادارہ اپریل 1907ء کو وجود میں آیا اور فوراً ہی اسکوائش کی بہتری کے عمل میں سرگرم عمل ہو گیا۔

ہارو اسکول انگلستان کے فارغ التحصیل طلباء جب مختلف شعبہ ہائے زندگی میں داخل ہوئے تو یہ کھیل ان کے ساتھ معاشرے کے دیگر شعبوں میں داخل ہو گیا۔ 1853ء تک اس کھیل کی مقبولیت

بہت بڑھ گئی تو انگلستان کی یونی ورسٹیوں، نجی کلبوں اور فوجیوں میں ریکٹس کا رواج پڑا۔ پھر یہ انگریز فوجیوں کے توسط سے سرحدیں پھلانگتا ہوا کینیڈا، امریکا، مالٹا، ارجنٹائن اور پھر برصغیر کی حدود میں داخل ہوا اور اس کی اہمیت بڑھانے کے لیے 1888ء میں لندن میں کوئنس کلب کے زیر اہتمام ریکٹس کے شوقیہ کھلاڑیوں کے مابین پہلی چمپئن شپ کا انعقاد کیا گیا۔ 1890ء میں پہلی مرتبہ اس کھیل کے قوانین مرتب کیے گئے اور اس کے قوانین بنانے والوں میں جولین مارشل اور میجر اسپنس کے نام نمایاں ہیں۔ جولین مارشل ٹینس کی تاریخ رقم کرنے والے شخص کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں جب کہ میجر اسپنس کا شمار ریکٹس کے کھیل پر مکمل عبور رکھنے والے افراد میں ہوتا ہے۔ ریکٹس اور اسکوائش میں گیند کا فرق ہے۔ ریکٹس کی گیند ٹینس کی گیند کی طرح سخت ہوتی ہے جب کہ اسکوائش کی گیند چھوٹی اور وزن میں ہلکی ہوتی ہے۔ اسکوائش کی گیند ریکٹس کے کھیل کی طرح زیادہ اچھلتی نہیں ہے۔

ریکٹس کے کھیل کی طرح اسکوائش کے کھیل کو بھی ہارو (Harrow) اسکول برطانیہ کے طالب علموں نے ایجاد کیا۔ جو طالب علم ریکٹس کھیلنے کے لیے کورٹس میں نہ جا سکے تو انہوں نے وقت گزاری کے لیے ہاسٹل کے صحن کی دیواروں پر گیند سے کھیلنا شروع کر دیا۔ اس طرح کورٹس کی کمی کے سبب آہستہ آہستہ ریکٹس کی جگہ اسکوائش نے سنبھال لی۔ اس کھیل کا نام اسکوائش یوں پڑا کہ ایک تو اس کھیل کے دوران گیند کو دیوار پر مارنے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے اس سے اسکوائش اسکوائش کی آواز سنائی دیتی ہے۔ غالب گمان یہی ہے کہ اس وجہ سے اس کھیل کو اسکوائش کہا جاتا ہے۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ ریکٹس کے ابتدائی دور میں جو گیند استعمال کی جاتی تھی وہ بہت سخت ہوا کرتی تھی جس کی وجہ سے کھیلنے والے نو آموز کھلاڑی زخمی ہو جایا کرتے تھے۔ بعد ازاں نو عمر طالب علموں کو نرم گیند کے ساتھ چھوٹے گراؤنڈ میں پریکٹس کرائی جانے لگی تو ان طالب علموں نے از راہِ مذاق اسے اسکوائش کہنا شروع کر دیا۔ آگے چل کر یہی مذاق حقیقت کا روپ دھار گیا اور اس کا نام اسکوائش پڑ گیا۔

ابھی اسکوائش اپنے ابتدائی مراحل طے کر رہا تھا کہ جنگ عظیم اوّل کے بادل چھانے لگے تو 1914ء سے 1919ء تک اور 1940ء سے 1946ء تک بوجہ جنگ عظیم دوم کھیلوں کے یہ مقابلے ساری دُنیا میں منعقد نہ ہو سکے۔ پھر جیسے ہی جنگ کے بادل چھٹے تو دوسرے کھیلوں کی طرح اسکوائش بھی کھیلا جانے لگا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد 1920ء میں اسکوائش کے پیشہ ور کھلاڑیوں کی لندن میں پہلی چمپئن شپ منعقد کی گئی۔ اسکوائش میں خواتین اور مرد دونوں کی چمپئن شپ ایک ہی سال شروع ہوئی۔ یہ منفرد اعزاز صرف اسکوائش کو حاصل ہے۔ 1930ء کو لندن میں برٹش اوپن اسکوائش ٹورنامنٹ کا آغاز ہوا جو متواتر ہوتے آ رہے ہیں جس کی شہرت وحیثیت ورلڈ اوپن اسکوائش ٹورنامنٹ سے کہیں زیادہ ہے۔

1920ء کے بعد انگلستان میں عالمی سطح پر مقابلے کرانے کے لیے لندن میں اسکوائش کے کورٹس کی حد کا تعین کیا گیا جس میں کورٹ کی لمبائی 32 فٹ اور چوڑائی 21 فٹ سامنے کی طرف سے 15 فٹ پیچھے کی سمت سے حد 7 فٹ مقرر کی گئی۔ اسکوائش کی بہتری کی خاطر برٹش اوپن کے بعد بین الاقوامی ٹورنامنٹ کے ایک شہرہ آفاق ٹورنامنٹ ورلڈ اوپن اسکوائش انگلینڈ میں 1976ء میں شروع کیا گیا جس کا پہلا فاتح آسٹریلیا کا جیف ہنٹ تھا جس نے ورلڈ اوپن کے فائنل میں پاکستان کے محب اللہ خان کو شکست دی تھی۔ پاکستان نے ورلڈ اوپن کا ٹائٹل مجموعی طور پر 14 مرتبہ جیتا۔ پہلی مرتبہ یہ اعزاز جہانگیر خان نے جیف ہنٹ کو 1981ء میں ہرانے کے بعد مجموعی طور پر چھ مرتبہ جب کہ اسی اعزاز کو ہم وطن جان شیر خان نے آٹھ مرتبہ جیت کر پاکستانی پرچم اسکوائش کے میدان میں لہرایا۔ پاکستان نے یو ایس اوپن کا پہلا گولڈ میڈل ہاشم خان کی کوششوں کے باعث 1956ء میں حاصل کیا۔ 1969ء میں شریف خان نے پہلا میڈل اور فاتح ٹرافی جیت کر پاکستان کی برتری کو قائم کیا، اس کے علاوہ بارہ سال شریف خان یو ایس چمپئن رہے۔

پاکستان کے ہاشم خان نے 1951ء میں برٹش اوپن اسکوائش میں پہلی کامیابی مصر کے محمود کریم کو 0-9، 0-9 اور 5-9 سے شکست دینے کے بعد حاصل کی۔ ہاشم خان 1958ء تک

مسلسل سات سال اس اعزاز کا دفاع کرتے رہے۔ درمیان میں 1957ء میں ہم وطن روشن خان نے یہ اعزاز ہاشم خان سے اپنے نام کرلیا۔ ہاشم خان کا تعلق پشاور سے چند میل کی مسافت پر واقع ایک گاؤں "نواحے کلے" (نیا گاؤں) سے ہے جہاں اس نے 1916ء میں آنکھ کھولی، ہاشم خان کے والد پشاور میں انگریزوں کے ایک کلب میں ملازم تھے جہاں پر اسکواش کھیلی جاتی تھی۔ اس زمانے میں اسکوائش کورٹ بغیر چھت کے ہوا کرتے تھے۔ دورانِ کھیل اکثر گیند کورٹ سے باہر چلی جایا کرتی تھی تو نوعمر ہاشم خان برق رفتاری سے باہر جاتے اور گیند اٹھا لاتے تھے۔ ان کی اس مستعدی کو دیکھتے ہوئے پانچ روپے ماہوار پر انہیں بحیثیت "Picker" یعنی گیند اٹھانے والے کے ملازم رکھ لیا تھا۔ جب ہاشم خان نے اسکوائش کی دُنیا میں اپنا پہلا قدم رکھا تو انہیں سخت محنت کرنا پڑی۔

ہاشم خان کے والد عبداللہ خان انتقال کر گئے تو ان کو ائیر فورس کلب میں بطور کوچ 50 روپے ماہانہ پر نوکری کرنا پڑی۔ 1950ء میں پہلی بار انگلستان میں جاری برٹش اوپن میں شرکت کا موقع ملا۔ یہ پہلے پاکستانی تھے جنھوں نے 1951ء میں برٹش اوپن اسکوائش ٹورنامنٹ میں کامیابی حاصل کر کے سبز ہلالی پرچم لہرا کر پاکستانیوں کا سر فخر سے بلند کر دیا۔ ہاشم خان کے بعد ان کے چھوٹے بھائی اعظم خان پانچ سال برٹش چیمپئن رہے۔ محبّ اللہ خان ایک بار، روشن خان ایک بار، جان شیر خان چھ بار اور سب سے زیادہ دس مرتبہ یہ اعزاز جیتنے والے جہانگیر خان ہیں۔ ان کے علاوہ قمر زمان بھی ایک بار اس کے فاتح رہے ہیں۔

☆......☆......☆

آگ میں گھِر جانا

مکان میں آگ لگ جائے اور آپ اندر گھِر جائیں تو حوصلے سے کام لیں اور ان باتوں پر عمل کریں:

1۔ گیلا رومال یا کپڑا منہ اور ناک پر رکھ لیں۔
2۔ کمرا دھوئیں سے بھر جائے تو دیوار کے ساتھ ساتھ دروازے کی طرف بڑھیں۔
3۔ فرش کی ہوا نسبتاً صاف ہوتی ہے اس لیے ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلیں۔
4۔ چلتے وقت ایک ہاتھ بڑھا کر رکھیں۔ ہاتھوں کی مٹھی بند رکھیں تا کہ بجلی کے ننگے تار سے بچاؤ ہو سکے۔
5۔ جلتے مکان میں سیڑھیاں خطرناک ہوتی ہیں۔ ہمیشہ دیوار کا سہارا لے کر الٹے پاؤں اتریں تا کہ پاؤں پھسلنے لگیں تو سنبھل جائیں۔
6۔ بچاؤ کے لیے بلندی سے چھلانگ لگانا چاہیں تو پہلے کسی مضبوط چیز کو پکڑ کر لٹک جائیں اور پھر چھلانگ لگائیں اس سے فاصلہ کم ہو جائے گا۔
7۔ کمرے میں چادریں ہوں تو ان کو آپس میں باندھ لیں اور کھڑکی سے باندھ کر اس کے سہارے اتر جائیں۔
8۔ اترنے کی کوئی سبیل نہ ہو تو کھڑکی میں سے مدد کے لیے پکاریں دروازوں کو حتی الوسع بند رہنے دیں۔ یہ آگ کو پھیلنے سے روکتے ہیں۔

گھر کا سامان

گھروں کو آگ لگ جائے تو جو چیزیں جلدی آگ پکڑ لیتی ہیں یا آسانی سے اٹھائی جا سکتی ہیں ان کو پہلے نکالیں۔ اس لحاظ سے گھریلو اشیاء کی اس طرح درجہ بندی کی گئی ہے:

1۔ پردے، بستر، باریک کپڑے، لیمپ، شیڈ۔
2۔ ٹوکریاں، بید کا فرنیچر۔
3۔ چوبی فرنیچر، چارپائیاں، تصویریں، لکڑی کی دوسری چیزیں۔
4۔ لکڑی کا دیگر سامان مثلاً دروازے، کھڑکیاں، چوبی دیواریں وغیرہ۔
5۔ غالیچے، دریاں، ٹاٹ۔
6۔ چھت میں لگا ہوا لکڑی کا سامان۔

ظاہر ہے کہ نمبر 1، 2، 3 اور 5 کو علی الترتیب جلدی ہٹایا جا سکتا ہے۔

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے اور 500 روپے کی کتب لیجیے۔
عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10ر نومبر 2013ء ہے۔
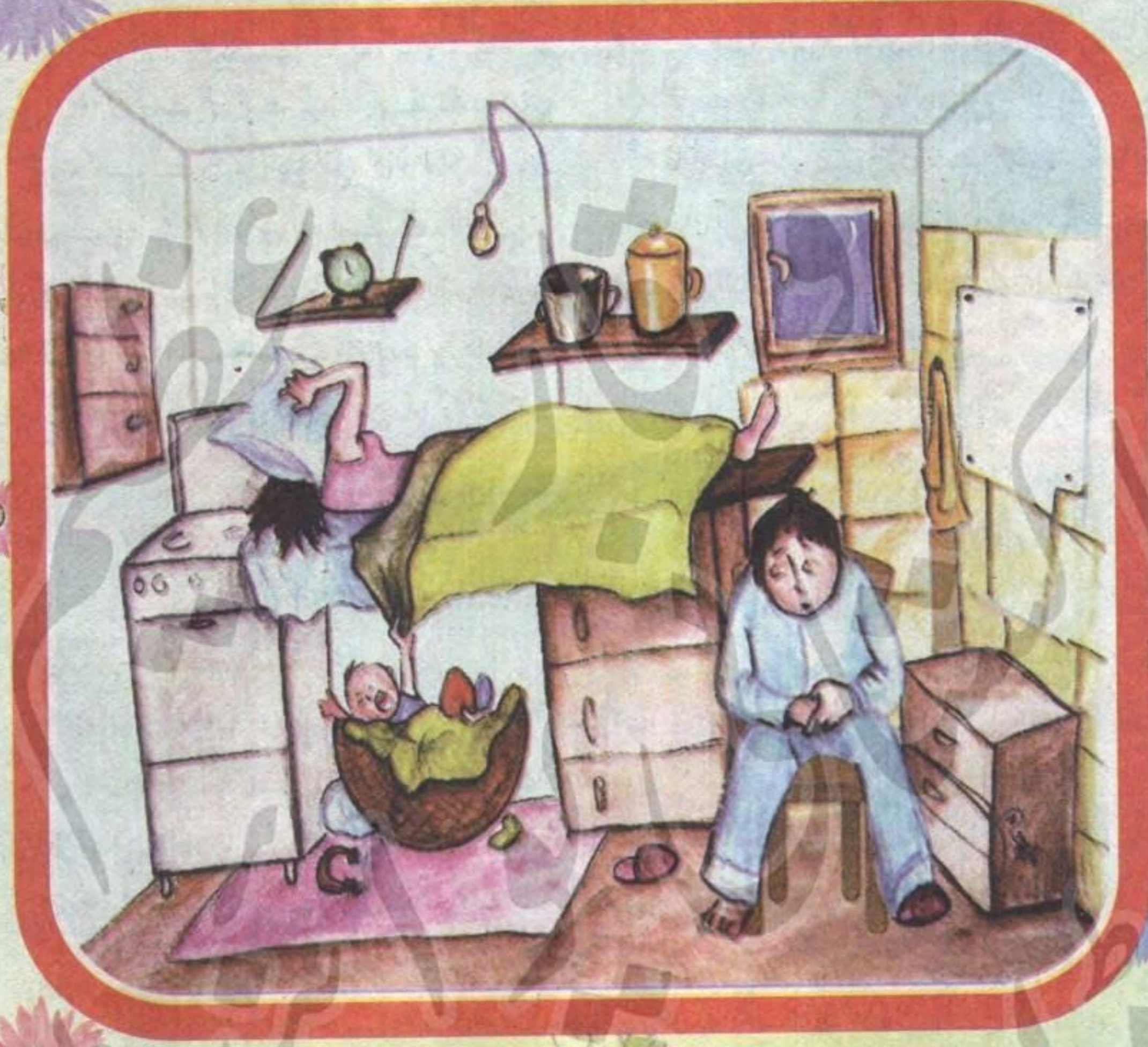
اکتوبر 2013ء کے "بلاعنوان کارٹون" کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

- ٹیبل ٹینس کا ہے یہ نیا کھلاڑی جو ہے سب پر بھاری۔ (محمد مجیر خان، بھکر)
- جتنا بھی دھتکارو گے میں جیتوں گا تم ہارو گے۔ (محمد طاہر ضیاء، اسلام آباد)
- دیکھنے والے بیٹھے حیران جانور کر رہا ہے کیسا کام۔ (عبداللہ شاہ، دریا خان)
- چل میرے موتی شارٹ لگا، اس چمپئن کے چھکے چھڑا۔ (حسنین رضا قادری، کاموکی)
- عجب زمانہ آیا یار کتے ہو گئے ٹینس سٹار۔ (محمد عتیق الرحمان، فیصل آباد)

محمد تسنیم آفتاب، کراچی (پہلا انعام :175 روپے کی کتب)

زین العابدین شاہ، خان پور (دوسرا انعام :150 روپے کی کتب)

ماہ رخ ناصر، سرگودھا (تیسرا انعام :125 روپے کی کتب)

ماریا سہیل، اٹک (چوتھا انعام :100 روپے کی کتب)

انیس فاطمہ، وزیر آباد (پانچواں انعام :90 روپے کی کتب)

احمد ایاز خان برکی، لاہور (چھٹا انعام :75 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: عباس خان، میاں والی۔ صالحہ ظفر، چکوال۔ سارہ فاطمہ، میاں والی۔ زونائشہ افضل، میاں والی۔ فضہ سکندر، سرگودھا۔ محمد ثاقب، رحیم یار خان۔ کشف عروج، تلہ گنگ۔ زین خان، سرگودھا۔ محمد بلال عباس، لاہور۔ صبغہ عرفان، چکوال۔ ردا نور، فیصل آباد۔ عبداللہ بن نعیم، جہلم۔ سید امان، دریا خان۔ فائقہ نوید، لاہور۔ رقیہ صدیقی، چکوال۔ میمونہ خان، ڈیرہ اسماعیل خان۔ سنبل ماہین طؔا، سرگودھا۔ عشا سعید، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ اقراء محمود، بورے والا۔ صفا رشید، کراچی۔ محمد فرحان، واہ کینٹ۔ عظمیٰ شہزادی، گجرات۔ اقصیٰ شہزادی، گجرات۔ ندا سعید، گجرات۔ خرم دستگیر، سیال کوٹ۔ بشریٰ سرور، گوجرانوالہ۔ مریم جاوید، لاہور۔ ذیشان صدیقی، کراچی۔ صوبیہ آصف، راول پنڈی۔ مہتاب نور، رحیم یار خان۔ آفاق شاہد، بورے والا۔ بینش اشرف، حیدر آباد۔ آمنہ صغیر، جھنگ۔ مشرف زیدی، قصور۔ حامد علی، خوشاب۔

نومبر کا موضوع
شیرنی اور اس کے بچے
آخری تاریخ 8 نومبر

دسمبر کا موضوع
مزار قائد اعظم
آخری تاریخ 8 دسمبر

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور سکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔